نگار

سالانہ چندہ (بیشگی)	قیمت فی کاپی
ہندوستان و پاکستان	ہندوستان (پاکستان)
آٹھ روپیہ ۲۵ پیسے	آٹھ روپیہ بارہ آنہ
۶۹ پیسے	۱۱ر

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا، ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت ؎ (علاوہ محصول)

من ویزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک عبقری کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتے سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی، اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے قیمت سات روپیہ آٹھ آنہ بعہ (علاوہ محصول)

مجموعۂ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) برزخ (۱۷) یاجوج و ماجوج (۱۸) ہاروت و ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ سفید و دبیز قیمت پانچ روپے آٹھ آنہ۔

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشار لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا، اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشار نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ مختصر تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے، نیا اڈیشن۔ قیمت چار روپیہ۔

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مارمن کا مذہب نہایت دلچسپ اور مفید کتاب ہے قیمت عہ علاوہ محصول

آیندہ مشاعرۂ نگار کے لئے

ذیل کا مصرعۂ طرح تجویز کیا گیا ہے :-

"وہ لطف پہ مایل ہو نہ سکے، میں جور کا خوگر ہو نہ سکا"

اس زمین میں صرف سات شعر سات مخصوص قافیوں میں مطلوب ہیں، اور وہ قافیے یہ ہیں :-

مکرر — ستمگر — جانبر — خنجر — سربر — اکثر — گوہر

مطلع و مقطع ضروری نہیں۔

یہ غزلیں ہم اکتوبر کے نگار میں شایع کرنا چاہتے ہیں، اس لئے حضرات شعراء سے التماس ہے کہ وہ ازراہِ کرم زیادہ سے زیادہ ۱۰ ستمبر تک اپنی غزلیں روانہ فرما دیں۔

نیاز

بعض کمیاب کتابیں

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا ——— قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں

توزک جہانگیری (ٹائپ) کامل	۳۰	کلیات جلال اسیر	۱۵	باقیات فانی	۴
تاریخ گلستانِ ہند - مصور	۳	ہفت قلزم کامل - مقبول احمد	۵۰	آفتاب داغ - نواب مرزا	۳
درۂ نادرہ - محمد مہدی خاں	۱۱	مصطلحات الشعراء درستہ	۵	گلزار داغ "	۱۰
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی	۷	فرہنگ جہانگیری ۲ حصے کامل	۳۰	انتخاب داغ "	۲
تاریخ فرشتہ ۲ حصے - محمد قاسم	۵۰	بہادر شاہ ظفر - امیر احمد علوی	۵	دیوان ولی معہ دیباچہ حیدر ابراہیم	۲
تذکرہ گلستانِ مسرت - عبدالرحمٰن	۲۳	مشاہیر اسلام ۲ جلد	۱۵	تاج سخن - بلیل مانکپوری	۷
تذکرہ علمائے ہند - رحمٰن علی	۲	سیرۃ النعمان - شبلی نعمانی	۵	دیوانِ ذوق - محمد حسین آزاد	۷
تذکرہ شوکت نادری	۲	تذکرہ ہندو شعراء - عبدالرؤف عشرت	۲	مرأت الغیب - امیر احمد مینائی	۷
دبستان المذاہب - مرزا محسن	۱۵	تذکرہ آبِ بقا "	۴	صنمخانۂ عشق "	۷
قصاید عرفی بحشی - جمال الدین	۳	تذکرہ آبِ حیات - محمد حسین آزاد	۹	دیوان امیر اللہ تسلیم	۵
دیوان ظہیر - فاریابی	۲	تذکرہ شمیم سخن تذکرہ شاعرات	۲	دیوان مجروح - میر مہدی	۵
کلیات غالب - اسد اللہ خاں	۱۸	دیوان ناسخ ۲ حصے - امام بخش ناسخ	۱۵	غنچۂ آرزو - میر وزیر علی صبا	۱۵
دیوان صائب - مرزا محمد علی	۲	دیوانِ ذوق - شیخ ابراہیم	۶	لغات کشوری	۱۲
دیوان کلیم - ابو طالب کلیم	۴۵	آیاتِ وجدانی - مرزا یگانہ	۷	مکاتیب امیر مینائی - احسن اللہ خاں	۹

پاکستان میں یہ کتابیں صرف اس صورت سے پہونچ سکتی ہیں کہ پوری قیمت مع محصول ڈاک ذریعہ بنک ڈرافٹ پہلے یہاں وصول ہو جائے۔ منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ اگست میں ختم ہوگیا اور ستمبر کا پرچہ وی، پی روانہ ہوگا

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۲۷	فہرست مضامین اگست ۵۷ء	شمار ۲

ملاحظات ---------- اڈیٹر ---------- ۴
مانی ---------- غبار یاور ---------- ۶
یادِ پاستین (دیر و حرم کے افسانے) ... سید وصی احمد بلگرامی -- ۱۰
محروم کی شاعری ---- گوپی چند نارنگ ---------- ۲۴
شبلی کی عشقیہ شاعری پر چند خیالات ... مفتون احمد --- ۳۱
مشکلاتِ غالب ---------- اڈیٹر ---------- ۳۵
غزل کا رکھ رکھاؤ ---- نقاد ---------- ۳۹
گاہے گاہے باز خواں! (خدا ہے یا نہیں؟) ... اڈیٹر ---- ۴۳
منظومات:- اثر لکھنوی - آل احمد سرور - فضا ابن فیضی
مہر اکبر آبادی - شفقت کاظمی - ارشد صدیقی
سرور بارہ بنکوی - ندیم جعفری ---- ۴۷
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۲

ملاحظات

محو حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ممکن ہے ڈاکٹر اقبال کو یہ حیرت انسان کی صرف علمی و ذہنی ترقیوں کو دیکھ کر ہوئی ہو، لیکن ہو سکتا ہے کہ دُنیا کی بین الاقوامی سیاست بھی ان کے سامنے رہی ہو جس کی بوالعجبی کا ادراک انھیں اُسی وقت ہو گیا تھا۔

دُنیا کا سب سے زیادہ المناک حادثہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی ذہن و عمل کے اختلاف و تضاد میں مبتلا ہو جائے اور اکثر اقوام و اُمم کے زوال و انحلال کا سبب ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ اس لئے اگر اس وقت بھی صورت یہی ہوتی تو ہم آسانی سے ایک نتیجۂ منطقی پر پہونچ کر دنیا کے مستقبل پر حکم لگا سکتے تھے۔ لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ آج جبکہ دُنیا کے بڑے سے بڑا شخص انتہائی خلوص سے نوعِ انسانی کی اصلاح و ترقی، دنیا کے امن و سکون کا خواہاں ہے اور اس کا یہ ذہنی رجحان صرف اس کی زبانی خواہش و تمنا نہیں، بلکہ اس کے دل کی پکار ہے اور وہ اسے بروئے کار لانے کے لئے عملی کوشش میں بھی مصروف نظر آتا ہے —— صورتِ حال یہ ہے کہ وہ منزل تک پہونچنے کی جتنی کوشش کرتا ہے منزل اتنی ہی دور ہوتی جاتی ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے:-

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

مگر یہاں تو سوال غفلت کا بھی نہیں، تساہل و تجاہل کا بھی نہیں، بلکہ یکسر بیقراری عمل و اضطراب امل کا ہے کامل اتحاد ذہن و عمل کا ہے اور

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

بھر بھی راہ گم اور منزل مفقود ہے ——

وہ زمانہ جب ایک ملک دوسرے ملک پر صرف اس لئے حملہ کرتا تھا کہ وہ اس پر قابض ہو جائے گزر چکا ہے اور اب عوام کی بیداری اور احساسِ آزادی نے اسکو ناممکن بنا دیا ہے کہ شخصی استبداد و اقتدار پھر عود کر آئے، یا کوئی مخصوص قوم یا جماعت کسی دوسری قوم یا جماعت کو محکوم رکھ سکے اور اس حقیقت کے پیشِ نظر دنیا کا ہر وہ شخص جو اپنی آواز میں کچھ بھی اثر رکھتا ہے، یہی کہہ رہا ہے کہ ہر قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دو، ہر ملک کو اس کے نقطۂ نظر سے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع دو، کیونکہ دنیا میں صحیح امن و سکون اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے، لیکن اس کی عملی صورت کوئی پیدا نہیں ہوتی۔

بلگانن، آئسن ہاور، ڈلنیز، میکملن، ٹیٹو، نہرو اور صدر چین، سب یہی کہتے ہیں، اور ان کا یہ کہنا خلوص سے خالی نہیں، لیکن دنیا کی بے چینی گھٹنے کی جگہ روز بڑھتی جا رہی ہے اور امن و سکون کی راہیں تاریک تر ہوتی جا رہی ہیں۔ اس وقت حالت بالکل ایسی ہے جیسے کسی گیند سے کچھ ہوا نکل جانے کے بعد اس میں ایک گڑھا سا پیدا ہو جائے اور آپ اسے دور کرنے کے لئے گیند کو دبائیں تو وہ گڑھا تو پُر ہو جائے گا لیکن دوسری جگہ دوسرا گڑھا پیدا ہو جائے گا اور یہ خلا پُر نہ ہو سکے گا۔ کوریا، کشمیر، ہنگری، اسرائیل، مصر، مشرقِ وسطیٰ، ہر جگہ ہم کو یہی گڑھے نظر آ رہے ہیں اور ان کے دور ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مجلس اقوام کا قیام بھی شاید اسی نوع کے سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لئے عمل میں آیا تھا اور غالباً سب سے پہلے امریکہ نے مشرقِ وسطیٰ میں اس خلا کے پُر کرنے کا اظہار کھلم کھلا کیا ہے، لیکن نہ وہ ساری سرزمین عرب کو اس پر متفق کر سکتا ہے اور نہ مشرقِ وسطیٰ کی تمام ریاستیں اس کی ہم آہنگ ہیں۔ پھر بجائے اس کے یہ خلا پُر ہوں جن کو دوسری بڑی طاقتیں پُر کرنا چاہتی ہیں ہوتے جاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مجلس اقوام خود اس کی تعمیر میں خرابی مضمر ہے اور بقول رہ گئی ہے۔ وہ ایک دفتر نصائح تو ضرور ہے یہ نصیحتیں صرف دوسروں کے لئے ہیں، خود جو ان نصائح پر ان سے عمل کرا سکے۔

روک تھام اصولاً سب تسلیم کرتے ہیں لیکن قوی تر بم بنانے کا سلسلہ برابر جاری ہے، کہ وہ اپنے تازہ ترین بم کا تجربہ کرتے ہوئے بھی ڈر رہا ہے کہ مبادا قطب شمالی کا تمام یخ بستہ علاقہ پگھل کر سارے کرۂ زمین کو ڈبو کر رکھ دے

پھر غور کیجئے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور باوجود اس کے کہ تمام قومیں امن و سکون کی خواہاں ہیں، کیوں ان اسباب کو دور نہیں کیا جاتا جو اس خواہش کی تکمیل میں حارج ہیں۔ یقیناً اس کا جواب مشکل نہیں، ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ اس کا سبب کوئی ذہنی اختلاف نہیں بلکہ اختلاف صرف راہِ عمل کا ہے اور اس کا دور ہونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ساری دنیا اس امر پر متفق نہ ہو جائے کہ انسانی زندگی کا صحیح معیار اس کی بلندی نہیں بلکہ اس کا اچھا ہونا ہے۔

انسانی زندگی کا معیار جب تک سرِ فلک عمارتوں، قیمتی موٹروں اور غیر ضروری اسباب زینت و آرائش کو قرار دیا جائے گا، کبھی یہ ذہنی تلاطم دور نہ ہوگا اور نہ موجودہ غیر اخلاقی، صنعتی و تجارتی مسابقت کا سدِ باب ہوگا جس پر اس وقت کی بین الاقوامی سیاست کی بنیاد قائم ہے، لیکن اب یہ ہونا نہیں، اس سیلاب کو رکنا نہیں اور آخر کار، دنیا کے موجودہ نظام تمدن و ترقی کو ایک نہ ایک دن تباہ ہونا اور اس کے ویرانے سے پھر ایک نئے انسان کو ابھرنا ہے، جو یقیناً بلگانن اور آئسن ہور نہ ہوگا بلکہ یہ وہ انسان ہوگا جس میں روح جلوہ گر ہوگی ابن عبداللہ کی، یسوع ناصری کی اور گوتم بدھ کی۔

مشاعرۂ نگار کی آئندہ طرح

"وہ لطف پہ مائل ہو نہ سکے میں جو رکا خوگر ہو نہ سکا"

صرف ذیل کے مخصوص قافیوں میں فکر فرمائیے:-

مکرر - ستمگر - جانبر - خنجر - سربر - اکثر - گوہر

مطلع و مقطع ضروری نہیں۔

امید ہے کہ ۱۰ ستمبر تک آپ کی غزل مجھے ملجائیگی۔ (نیاز)

مانی

۲۱۶ء — ۲۷۶ء

(افادات ایم۔ اسپرنگ لنگ)

(غبار یاور)

ایران میں ظہور اسلام سے پہلے زرتشتی، مانوی اور مزدکی مذاہب کو علی الترتیب فروغ حاصل ہوا۔ شاہ بہرام نے مانوی مذہب ختم کرنے کی کوشش کی اور نوشیرواں عادل نے مزدکی مذہب کو نیست و نابود کیا۔ زرتشتی مذہب کی ابتدا ساتویں صدی قبل مسیح میں ہوئی، تقریباً ڈھائی سو سال بعد جب چوتھی صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم نے ایران کو فتح کیا تو یونانی اثرات کے تحت زرتشتی مذہب کی مقبولیت ختم ہوگئی۔ ۲۲۴ء میں جب اردشیر (اول) باپ کان نے ساسانی حکومت کی بنا ڈالی تو دوبارہ اس مذہب کو عروج حاصل ہوا اور ساتویں صدی عیسوی تک یہ ایران کا قومی مذہب رہا۔ مسلمانوں کی فتح ایران کے بعد مذہب زرتشتی کے ماننے والوں کی بہت بڑی تعداد اطراف ہند اور دوسرے ممالک میں متوطن ہوگئی۔ زرتشتی مذہب کی ابتدا سے پہلے ایران میں مترائی مذہب رائج تھا، جس کا تعلق قدیم اقوام کی آفتاب پرستی سے تھا۔ عہد عتیق میں تقریباً سارے ایشیا اور یورپ کے علاقوں میں سورج کی پرستش رائج تھی۔ مترائی مذہب فرسودہ عقاید و رسوم کا مجموعہ تھا۔ اس کی اصلاح کے لئے ہندوستان میں مہاتما گوتم بدھ اور ایران میں زرتشت نے کوشش کی۔ باوجود اس کے کہ ایشیا اور یورپ میں بدھ اور زرتشت کے مذاہب خاطر خواہ کامیاب ہوئے، لیکن وہ متراثیت کے قدیم اثرات یک سر ختم نہ کر سکے بدھ اور زرتشت کے بعد جتنی اعلیٰ مذہبی شخصیتیں ہندوستان و ایران میں پیدا ہوئیں ان کی بھی کوششوں کا مقصد قدیم براہمنیت اور متراثیت کے فرسودہ عقائد ختم کرنا تھا۔

مانی کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہے، جنھوں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کر کے ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ اس نے اپنی تعلیمات میں آدم، نوح، زرتشت، بدھ اور (حضرت) عیسیٰ وغیرہ کے خیالات و افکار کو پیش کیا۔ باوجود اس کے کہ وہ (حضرت) موسیٰ کی تعلیمات سے متاثر تھا، مگر یہودی اور عیسائی اسے کافر اور ملحد گردانتے تھے۔ مانی نے ایران و عراق کے قدیم مذہبی عقاید کو عیسائیت اور افلاطونیت کے انداز پر بدلنے کی کوشش کی مگر پارسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں نے اس کی تعلیمات کو چنداں اہمیت نہ دی اور آخر کار تیرھویں صدی عیسوی کے بعد مانوی مذہب کا نام و نشان کبھی دنیا سے مٹ گیا۔

مانی کا تعلق ایک بہت اونچے خاندان سے تھا۔ اس کے باپ کا نام باتق اور ماں کا مریم تھا۔ باتق کا باپ حکومت کا ایک اعلیٰ عہدیدار تھا اور ابرسام کہلاتا تھا۔ مانی کی ماں پارتیہ کے شاہی خاندان اشکانیہ سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ شاہی خاندان پارتیہ سے نقل وطن کر کے دریائے دجلہ کے کنارے بغداد اور قطسیفون کے مابین ایک گاؤں میں سکونت پذیر تھا، جس کا موجودہ نام اکفرومیہ ہے۔ یہاں اس خاندان نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس زمانہ میں عیسائیوں میں بے شمار فرقے تھے۔ اس نواح کے عیسائی مغتسلی فرقے کے نام سے موسوم تھے۔ اسی خاندان میں مانی کے باپ باتق نے مریم سے شادی کی۔ مانی کی تاریخ پیدائش غالباً ۱۴ اپریل ۲۱۶ء ہے۔ اس وقت

مغربی ایران، عراق اور بازنطین پر آلِ بارتیہ کی حکومت تھی۔ مانی کی عمر آٹھ سال تھی جب فارس کا ساسانی بادشاہ اردشیر (اول) بابکان سارے ایران و عراق پر قابض تھا۔ مانی کے لڑکپن کے حالات نامعلوم ہیں۔ لیکن اس کی تخلیقات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً اُس کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر ہوئی ہوگی۔ اُس عہد کے مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ مانی کو مترائیت، زرتشتیت، بدھ دھرم، یونانی اور ایرانی علوم، توریت، انجیل وغیرہ پر کافی عبور تھا۔ اُس نے مصوری، خطاطی اور عمارتی نقشہ کشی میں بھی مہارت بہم پہونچائی تھی۔ اوستا اور پہلوی زبانوں کے ساتھ ساتھ اُس نے ارامی اور سریانی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ اُس نے ایک نیا رسم خط بھی ترتیب دیا جو اپنے موجد کے نام پر مانوی کہلاتا تھا۔ اِس خط کے لئے اُس نے حروفِ تہجی بھی وضع کئے تھے۔ ایران کے قدیم ادبی و مذہبی سرمایہ میں مانی کی تخلیقات سے بہتر سریانی اور یونانی علوم پر مشتمل کوئی ذخیرہ موجود نہیں۔ کتابوں کو تحریر اور مذہب کرکے خوشنما طریقے پر آراستہ کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ مصوری اور شاعری میں اُس نے وہ کمال بہم پہونچایا کہ آج بھی وہ کلاسیکی فنونِ لطیفہ کا معیار تسلیم کی جاتی ہیں۔ مذہبی معاملات میں اہلِ کلیسا اور حکمراں طبقے نے جتنا اسے معتوب کیا اتنا ہی وہ اپنی شاعری، موسیقی اور مصوری کی بدولت عوام میں محبوب و مقبول ہوا۔

علمی صلاحیتوں کے باوجود مانی نے ادب اور مصوری کو اپنا موضوعِ حیات نہیں بنایا بلکہ اس کا اصل موضوع مذہب ہے۔ مانی کے لئے یہ موضوع منتخب کرنے کے کچھ اسباب تھے، جن کا علم اُس وقت کے مملکتی حالات سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جب سیاسی کرب اور جنگ نے معاشری نظام درہم برہم کرکے سارے علاقہ میں قحط کی صورتِ حال پیدا کردی تھی۔ معاشرے میں جمود و تعطل پیدا ہوگیا تھا اور تخلیقی قوتوں کی راہیں مسدود ہوچکی تھیں۔ چنانچہ انھیں حالات اور ماحول کی اس کشمکش میں مانی نے مذہبی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب یہودی اور عیسائی اثرات سے زرتشتی مذہب بھی محفوظ نہ رہا تھا۔ سلطنتِ روما میں یہودیت کے دوش بدوش عیسائیت کو بھی فروغ حاصل ہوچکا تھا، یونانی دیومالا، قدیم مصری مذاہب، بودھ دھرم اور ایرانی مترائیت کے اثرات یورپ میں جزائر برطانیہ تک پہونچ چکے تھے۔ اِن مختلف مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے سبب سے فلاسفۂ یونان کے عقاید سارے مذاہب پر حاوی ہوگئے تھے اور جس کے نتائج نوافلاطونیت کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ غرض کشان و توران سے لیکر یونان و روما تک جس مذہبی کشمکش کا ماحول تھا اُس کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسا مذہبی تصور پیش کیا جائے جو وقت کے تقاضوں کو بدرجۂ اتم پورا کرے۔ انھیں حالات میں مانی نے اپنا نظریۂ مذہب پیش کیا۔

کہا جاتا ہے کہ مانی کی عمر جب بارہ سال تھی تو ۲۲۸-۹ء میں پہلی بار اُس پر وحی نازل ہوئی۔ جس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ شعور اور مشاہدہ نے اُس میں ایک تخلیقی جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اُس نے عوام الناس میں تبلیغِ مذہب کا کام ۲۴۰ء کے قریب شروع کیا اور تاحیات پینتیس سال کی مدت تک اسے جاری رکھا۔ ابتدا کے دس بیس سالوں میں وہ مطالعہ و تصنیف و تخلیق میں مصروف رہا۔ انھیں ایام میں اُس نے اپنے تشکیل کردہ مذہب کے متعلق سات کتابیں تصنیف کیں، اُن میں سے ایک کتاب بادشاہ شاہ پور (اول) کے لئے پہلوی زبان میں لکھی، جس کا نام "شاہ پورکان" ہے۔ اُس کی کتابوں کا صحیح زمانۂ تصنیف متعین نہیں کیا جا سکتا البتہ پہلوی زبان کی تصنیف کے متعلق اُس کے مجموعہ مکاتیب میں چند اشارے موجود ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُس کی آخری تصنیف ہے۔ مانی کا مجموعۂ مکاتیب اُس کے انتقال کے بعد اُس کے متبعین نے مرتب کیا۔ اردشیر (اول) باب کان کے دورِ حکومت کے بعد اُس کے متبعین نے مرتب کیا۔ اردشیر (اول) باب کان کے دورِ حکومت کے اختتام پر (۲۳۹-۴۰ء) مانی نے گوشہ نشینی ترک کردی اور عوام میں تبلیغ مذہب شروع کی۔ تبلیغ مذہب سے پہلے اُس نے اپنی مذہبی کتابیں مرتب کرلی تھیں۔ ان کتابوں میں مختلف علوم، فلسفہ و الٰہیات، وغیرہ کو جگہ دی ہے۔ دیگر بانیان مذاہب کی تعلیمات اور پیغامات کو مانی کے متبعین نے مرتب کیا ہے، لیکن مانویت غالباً دنیا میں وہ واحد مذہب تھا جس کے صحائف خود اُس کے بانی نے تصنیف کرکے مشتہر کئے۔

مانوی مذہب کی بنیاد قدیم مذاہب کے برخلاف فلسفیانہ، دقیق اور مافوق الفطرت افکار پر قایم تھی - مانی کا خیال تھا کہ کائنات کی تخلیق دو عنصر یعنی خیر اور شر سے ہوئی ہے جو آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں - علمائے اسلام نے اسی لئے اُسے زندیق گردانا ہے۔

مانی نے قدیم فرسودہ عقائد اور توہم پرستی کو اپنے مذہب میں کوئی جگہ نہیں دی، بلکہ سحر و افسوں اور بت پرستی کی سخت مخالفت راستی، عدم تشدد اور عدم عصبیت پر کافی زور دیا - اُس کا مذہب دراصل قدیم فلسفۂ اخلاق سے ماخوذ تھا اور یہی حقیقت اُسے زندگی کے مادی ارتقا سے قریب کرتی ہے - مانی نے خدا کو ایک بزرگ ہستی اور مصلحین و پیغمبران کو برحق تسلیم کیا ہے - خدا کی ذات و صفات اور اُس کی وحدت پر مانی نے کوئی گفتگو نہیں کی بلکہ اُسے صرف ہادیِ کامل اور پیکرِ نور گردانا ہے - مانی کے نزدیک ملائکہ اور دیوتاؤں کو قربِ خداوندی حاصل ہے -

صحیح طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ مانی کے مذہب کی تبلیغ دنیا کے کتنے حصوں میں ہوئی - لیکن یہ ضرور ہے کہ مشرق میں چین اور مغرب میں فرانس تک اُس کی تعلیم و مذہب کی اشاعت ہوئی - مقامی اثرات کی بنا پر چین کے پیروانِ مانی نے اپنے مذاہب میں کنگ فوزے کی تعلیمات کے اجزا بھی اُسی طرح شامل کر لئے - وہ اپنے کو خاتم البنیین بھی کہتا تھا - اُس نے خود کو (حضرت) عیسیٰ کا جانشین گردانا اور نہ صرف تقریر و تحریر میں اس کا اعادہ کیا بلکہ اپنی مہر میں بھی ظاہر کیا - مانی کی یہ مہر سریانی تحریر و تصاویر پر مشتمل ہے، اور پیرس کے قومی ذخیرۂ اناجیل میں محفوظ ہے - اُس زمانہ میں دین عیسوی ایک ترقی پذیر مذہب تھا - یہی سبب ہے کہ مانی کو حضرت عیسیٰ کی پیروی اور اُن کے مذہبی تخیلات و کردار کو مقامی حالات کے تحت ردوبدل کر کے پیش کرنے میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی -

مانی نے مذہبی تبلیغ کو اپنے ہی قریہ اور صوبہ کے لوگوں تک محدود نہ رکھا بلکہ ساسانی مملکت کی مشرقی سرحدوں، موجودہ پنجاب سرحد اور جنوب میں کشان موجودہ سندھ و بلوچستان، تک پھیلانے کی کوشش کی - اس غرض سے اُس نے متعدد بحری سفر بھی کئے خلیج فارس کی قدیم بندرگاہ اُبلہ سے روانہ ہو کر وہ کراچی آیا اور کافی عرصے تک موجودہ پاکستان کے جنوب مغربی علاقوں میں تبلیغ مذہب کرتا رہا - مغرب میں ممالک عرب، شمالی افریقہ، ترکیہ اور یونان وغیرہ کا سفر کیا - اپنے شاگردوں کو مشرق میں چین اور مغرب میں اندلس تک تبلیغ کے لئے روانہ کیا - اشاعت مذہب کے لئے مانی نے آرامی زبان منتخب کی تھی لیکن مختلف مقامات میں وہاں کی مقامی زبانوں میں بھی اپنے پیغامات دوسروں تک پہونچائے - فہرست ابن ندیم میں منقول ہے کہ خلیج فارس کے سفر میں اُس کا باپ باتق بھی اُس کے ساتھ تھا - اکثر مورخین نے لکھا ہے کہ وہ ایران سے فرار ہو کر ہندوستان گیا تھا - بعض نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ہندوستان وہ بدھ مذہب کی تعلیم حاصل کرنے آیا تھا - مگر یہ تمام باتیں پایۂ تحقیق سے ساقط ہیں - مانی نے جس طرح دیگر مذاہب سے اعتقادی اور اخلاقی عناصر اخذ کئے اُسی طرح بدھ مت سے بھی بہت سے مسائل مستعار لئے - وہ اپنے کو بدھ مت کا پیرو بھی کہتا تھا اور جانشینِ عیسیٰ کے ساتھ نائب بدھ ہونے کا بھی مدعی تھا - جس طرح اُس نے دینِ عیسوی کو زندگی آمیز طریقے سے نکھارا، اُسی طرح بدھ مت کو بھی ایک نئی شائستگی بخشی - مانی نے تقریباً اُن تمام علاقوں میں اپنے مذہب کو پھیلانے کی کوشش کی موجودہ مغربی پاکستان میں شامل ہیں، لیکن اُن کے پیروان کی زیادہ تعداد مکران و بلوچستان میں تھی - اس سلسلہ میں مشہور مورخ البیرونی نے ایک قطعی بے بنیاد بات لکھی ہے اور وہ یہ کہ "مانی نے ہندوستان میں اپنا وقت گوشۂ گمنامی میں گزارا" حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اپنے قیام ہندوستان کا زمانہ اپنے مذہب کی تبلیغی سرگرمیوں میں بسر کیا ابنِ ندیم کی روایت ہے کہ "مانی کے ایک مکتوب سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ ہندوستان سے واپس اپنے وطن چلا گیا تب بھی اپنے ہندوستانی پیروان سے رابطہ قایم رکھتا تھا" تقریباً ۲۴۲ء میں مانی ہندوستان سے بحری راستہ سے اپنے وطن کے لئے روانہ ہوا -

ہندوستان میں تقریباً ایک سال قیام کرنے کے بعد مانی، ایران و عراق میں تبلیغ کی غرض سے روانہ ہوا - فہرست ابن ندیم میں اُس کی چالیس سالہ سیاحت کا ذکر موجود ہے، لیکن حقیقت میں یہ چالیس نہیں بلکہ چار ہے - وطن آنے کے کچھ ہی دنوں کے بعد تمام اطراف میں اشاعتِ مذہب کا کام پھر شروع کیا، لیکن کامیاب نہ ہوا اور آخر کار وہ دارالسلطنت مداین میں واپس آیا - یہاں آنے کے کچھ ہی دنوں

کے بعد بادشاہ شاہ پور (اول) ہے شن شاہ نے اُسے طلب کیا۔ شاہی دربار میں طلبی کا سبب یہ تھا کہ مزدائی کاہن نے بادشاہ سے مانی کے خلاف شکایتیں کی تھیں اور اُس کے اصلاحِ مذہب کی تحریک کو ختم کرنے پر زور دیا، مگر جب بادشاہ نے مانی سے گفتگو کی تو وہ اُس کی عظمت و ذکاوت سے بہت متاثر ہوا، اور دارالسلطنت مدائن میں اسے اپنے مذہب کی اجازت دیدی، مگر خود بادشاہ نے اپنے مذہب مزدائیت کو ترک نہیں کیا دوسری ملاقات میں اُس نے مانی کو کچھ مراعات دیں۔ تیسری ملاقات میں مانی نے اپنی تصنیف کردہ کئی کتابیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ جنھیں باوجود اس کے کہ وہ بادشاہ کے مذہبی عقاید سے مختلف تھیں مگر اُس نے انھیں شاہی کلیسا کے کتب خانے میں رکھے جانے کا حکم دیا۔ یہی اسباب ہیں کہ مانوی ادب میں شاہ پور کے عدل، مساوات اور استحکام کی تعریف کی گئی ہے۔ خود مانی نے اپنی ایک تصنیف "شاہ پور کان" قدیم فارسی زبان میں تحریر کی جو بادشاہ سے تین ملاقاتوں کا نتیجہ تھی ——— چونکہ بادشاہ اُس کا مربی تھا اس سبب سے ۲۵۰ء کے اختتام تک مانی کی تبلیغی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ جب بادشاہ شاہ پور (اول) نے روم کے نابالغ فرمانروا یزدان قیصر کے خلاف فوجکشی کی تو مانی بھی شاہی لشکر کے ہمراہ تھا۔ اس سے قبل رومیوں نے فارس کی حکومت پر حملہ کر کے شام کے شہر انطاکیہ پر قبضہ کر لیا تھا، مگر شاہ پور (اول) نے شن شاہ نے رومیوں پر حملہ کر کے اپنے مقبوضات دوبارہ حاصل کر لئے۔ اس جنگ نے مانی کے لئے افریقہ اور یورپ کے دروازے کھول دئے۔ اُس نے اپنے متعدد شاگردوں کو تمام اطراف یوروپ و ایشیا میں اشاعتِ مذہب کے لئے روانہ کیا۔ مغربی اطراف میں مانی نے تقریباً دس پندرہ سال تبلیغ میں صرف کئے ہوں گے۔ خیال ہے کہ ان ایام میں وہ زیادہ عرصے انطاکیہ، قونیہ اور قیصریہ میں رہا۔ جہاں جہاں لوگ اُس کے حلقۂ مذہب میں آتے جاتے تھے وہاں وہ مراسلت کا سلسلہ قایم کر لیتا تھا اور مناسب موقعوں پر خود بھی اندرون و بیرون ملک جا کے مشاہدہ، اصلاح اور تبلیغ کا کام کرتا تھا۔

ایران میں زرتشتی مزدائیت کو بہت فروغ حاصل تھا۔ جب مانی کی سرگرمیاں اپنے عروج پر تھیں تو مزدائی علماء کی طرف سے اُسکی مخالفت شروع ہوئی۔ آلِ شاپور کا وہ ہاتھ جو مانی کا سرپرست تھا اب اُس کی اور اُس کے پیروان کی سرکوبی کے لئے اُٹھا۔ یہ مخالفت شاہ پور، رد ویم کے دور میں ہرمزد اردشیر (دویم) کے زمانہ میں اور شدت اختیار کر گئی۔ اُس کے بعد اُس کی وصیت کے برخلاف اُس کا بڑا لڑکا گمراہ بادشاہ ہوا کیونکہ اُسے زرتشتی کاہنوں کا تعاون حاصل تھا۔ اس کے بعد اُس کا لڑکا درہرام اور پھر پوتا بہرام علی الترتیب فارس کے تخت پر بیٹھے۔ یہ تینوں بادشاہ مذہب زرتشت میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ تقریباً ۲۷۲-۲۷۳ء میں ہرمزد اردشیر (دویم) نے مانی کو جنوبی عراق کے علاقوں میں سکونت کی اجازت دیدی تھی، مگر اس عالی ظرف بادشاہ کا دور محض ایک سال رہا۔ ہرمزد اردشیر (دویم) کے بعد ساسانی حکومت کا زوال شروع ہوا اور آلِ ناسانی نے اقتدار حاصل کر لیا۔

بہرام کے تیسرے اور آخری سال حکومت (۲۷۶ء) میں مانی اپنے آخری سفر کے لئے روانہ ہوا۔ اور غالباً وہ خوزستان اور اہواز کی راہ سے بہرائچ حدود سلطنت کو عبور کر کے بذریعہ سمندر کشان اور سیستان کی جانب جانا چاہتا تھا، لیکن مانی کے لئے حدود مملکت سے پار ہونے کے تمام راستے بند کر دئے گئے۔ بحری جہاز رانوں کو حکم دیدیا گیا کہ مانی کو سوار نہ ہونے دیں۔ بادلِ ناخواستہ مانی کو دریائے دجلہ میں کشتی کے ذریعہ واپس جانا پڑا۔ یہ اُس کا آخری سفر تھا۔ آخر کار وہ دارالحکومت مدائن میں داخل ہوا۔ اُسے فوراً ہی دربار میں طلب کیا گیا اور اُس کے خلاف بہت سے الزامات لگائے گئے۔ الزامات کی نوعیت یہ تھی کہ مانی نے مزدائیت کو ختم کرنے کی کوشش کی، اور بادشاہ اور رعایا کے مذہب کو بدلنا چاہا۔ مانی اپنے تین شاگرد اور ایک وکیل کو ساتھ لیکر دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اور اُس کے حواری اُس وقت شکار سے واپس ہوئے تھے اور کھانے میں مشغول تھے۔ مانی کو ایک انتظار گاہ میں ٹھہرنا پڑا۔ کھانے سے فراغت کے بعد بادشاہ نے طعام گاہ سے موت کے احکام جاری کر دئے۔ اور اُسے نہایت ہی بے رحمی سے ہلاک کیا گیا اُس کے جسم کو زنجیروں سے جکڑا گیا اور گھسیٹ کر ایک کوٹھری میں ڈال دیا گیا۔ مانی کے احباب اور معتقدین عورت و مرد قید کے ایام میں اُسکے پاس آتے تھے جنھیں وہ ہدایات دیتا رہتا تھا۔ اُس نے مار آمو کو آخری نصیحتیں کیں جو "حروف سہر" کہلاتی ہیں۔ مار آمو اُس کے شاگردوں میں بہت اہمیت رکھتا تھا اور مانی کے بعد وہی اُسکا جانشین ہوا۔ چھبیس دن اسی طرح جکڑے رہنے کے بعد آخر کار وہ آخری وقت پہونچا۔ اُس وقت تین مرد اور بہت سی عورتیں موجود تھیں جبکہ کھلی چارپائی پر وہ بڑی بڑی آنکھیں نکالے مردہ پڑا تھا۔ عورتوں نے اُس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اُس کے بعد بادشاہ کے حکم سے سب لوگ وہاں سے ہٹا دئے گئے۔ بعد بادشاہ کے حکم کے مطابق اُسکے ناخونوں میں سوئیاں چبھو کر یقین کر لیا گیا کہ وہ واقعی مر گیا ہے اور بے ہوش نہیں ہے۔ اُسکے بعد سر جسم سے کاٹ کر الگ کیا گیا اور غالباً سر راہ اس کی نمائش کی گئی اور جسم کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر مختلف اطراف میں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا اُسکے معتقدین اور دوستوں نے اُسکے جسم کے بہت سے ٹکڑوں کو اکٹھا کیا اور مدائن میں دفن کر دیا۔

یادِ پاستین

(دیر و حرم کا افسانہ)

(سید وصی احمد بلگرامی)

سید وصی احمد بلگرامی ایک خاص طرز انشا کے مالک ہیں اور نگار کے ابتدائی دور میں ان کے متعدد مضامین نگار میں شایع ہو چکے ہیں۔ (نیاز)

ایک مسلمان نے کسی دہریے سے پوچھا کہ تو خدا کو کیوں نہیں مانتا تو دہریے نے جواب دیا کہ تمہارا خدا ماننے کے قابل ہو تب کوئی مانے یا یوں ہی ان لے تم چھیڑتے ہو تو سنو۔

زہرا بائی پیدا ہوئی اور بڑھی تو اس کی آنکھوں کو دیکھ کر شرابی ہوشیار اور ہوشیار شرابی ہو گئے۔ مگر اسی محلہ میں شریفن پیدا ہوئی تو دونوں آنکھوں سے اندھی۔ اندھی شریفن کو انکھیا سے کمینوں نے زندگی بھر نہ پوچھا، تمہارا خدا اگر انصاف در تھا تو اس نے شریفن کو اندھا پیدا کر کے خاتے کیوں کرائے اور زہرا بائی کو چشم میگوں دے کر بادۂ عشرت کیوں پلایا ؟

عین طوفان میں ایک بچہ تباہ شدہ کشتی کے تختے پر پیدا ہوتا ہے، ماں فوراً مر جاتی ہے، سمندر کا تلاطم اس ٹوٹے ہوئے تختہ کو ساحل پر لگا دیتا ہے، بچہ صحیح سلامت رہتا ہے اور مہ نو کی طرح بڑھتا ہے، اس کا عوض بہشت شداد سے پوچھ لو۔ مگر ایک دوسرا بچہ سیتھ کروڑی چند (عرف لاوارث) کے یہاں پیدا ہوتا ہے، اور شفاء الملک کی نگرانی میں دیا جاتا ہے، لیکن شفاء الملک بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور نوزائیدہ دم توڑ چکا۔ اگر تمہارا خدا رحیم ہے تو لاوارث سیٹھ کے جگر میں ناسور کیوں ہے ؟ یہ کیا ہے کہ جو بچہ طوفان کی گود میں تھا وہ بچا لیا گیا اور جو بچہ شفاء الملک کی گود میں تھا وہ چھین لیا گیا ؟

مصر کے فراعنہ اپنی شادی زیادہ تر اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے کرتے تھے اور جب یہ نعمتیں ان کو میسر نہ ہوتیں تب کہیں باہر سے لڑکی لاتے تھے، وہ اس خیال سے کہ باہر کی لڑکی آئے گی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے میکہ والے سازش کر کے تخت مصر کو اپنے خاندان میں منتقل کر لیں اور کبھی اس خیال سے کہ دنیا بھر کی آسائش جب اپنی لڑکی اور بہن کو خود دے سکتے ہیں تو پھر کسی داماد یا بہنوئی کی تلاش میں گدائی کیوں کی جائے، اور کبھی اس خیال سے کہ اپنے خانہ ساز کی چڑیا باغ اغیار کی ہزار داستان سے اچھی ہے، بہرکیف اس فلسفہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرعونوں نے اپنی شادی سگی بہن یا بیٹی سے کی تو اس کا بیٹا فرعون نے اپنی ماں کا سگا بھائی اور اپنی پھوپی کا بیٹا ہوا۔ اور خود فرعون نے اپنے بیٹے کا نانا اور اپنے بھانجے کا باپ ہوا۔ اور فرعون نمبر ۲ کی ماں اپنے شوہر کی نواسی ہوئی۔ یہ فرعونیت تمہارے خدا کو اگر بھائی نہ تھی تو اس نے ان کنتوں کو تخت مصر پر لوٹنے کیوں دیا ؟ میرا روئے سخن جام فرعونیت کے اس تلچھٹ کی طرف نہیں ہے جس کو عہد موسوی کے افسانہ گو کہتے ہیں کہ تمہارے خدا نے دریائے نیل میں بہا دیا تھا، سوال یہ ہے کہ بیسیوں فراعنہ جو صدیوں تک اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے شادیاں کرتے رہے اور جن کی نجاست سے دنیا نجس ہو گئی، ایسے گروہ مصر و حبش کی شاہنشاہی کے لئے کیوں چھوڑ دیے گئے ؟

واہ رے تمہارا خدا کہ ابرہہ کی سرکوبی کے لئے ابابیلیں اور ابابیلوں کے چنگل میں کنکریاں بھیجتا ہے مگر ۶۲ء میں جب خود کلمہ گویوں نے مکہ کا محاصرہ کیا، خانۂ کعبہ کو نقصان عظیم پہونچایا اور ۸۳ھ میں مسجد نبوی کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور انصار کو چن چن کر مارا اور ۱۴۳ھ ہجری میں جب خلیفۃ المنصور

لے ہسٹری آف سرسین، مصنفہ جسٹس امیر علی صفحہ ۸۸ — ۸۹ — لے ہسٹری آف سرسین مصنفہ جسٹس امیر علی صفحہ ۲۲۳۔

نے مدینہ کا ناکہ کرکے قحط کرادیا، اور امام ابوحنیفہ کو قید خانہ میں جھونکا اور امام مالک کو کوڑے لگائے اور ۳۱۷ھ میں جب ابوطاہر[1] نے عین حج کے دن حاجیوں کو ذبح کیا، اور سنگ اسود کو اکھاڑ کر بائیس برس تک بیت اللہ کو بے چراغ رکھا۔ ان موقعوں پر تمہارا خدا ابابیلوں اور کنکریوں سے مطلق کام نہیں لیتا۔ آخر کیوں ؟ میزبان نے اپنے مہمان حاجیوں کو ذبح ہونے سے کیوں نہ بچالیا، صاحبِ خانہ نے گھر کو تاراج ہونے کے لئے بے پناہ کیوں چھوڑ دیا ؟

یہودیوں نے حضرت عیسیٰ[2] کو طمانچے لگائے، منہ پر تھوکا، اور سولی پر چڑھایا تمہارا خدا کہاں تھا کہ ایسے وفادار غلام کی ذلت دیکھتا رہا، تمہارے رسول کے راستہ میں کانٹے بچھائے گئے، بدن پر اونٹ کی انتڑیاں ڈالی گئیں، زہر دیا گیا۔ تمہارا خدا کہاں تھا کہ اس نے اپنے حبیب کو اسی طرح نہ بچالیا جس طرح افسانہ گو کہتے ہیں کہ اس نے جناب خلیل کو آتشِ نمرود سے اور جناب موسیٰ کو دریائے نیل سے بچالیا ؟ - تمہارے رسول کے نواسے کا سر کاٹ کر نیزہ پر چڑھایا گیا، اور پھر دربارِ عام میں یزید کے سامنے تحفۃً پیش ہوا اور یزید نے لب ہائے شہید سے گستاخیاں کیں! تمہارا خدا اس وقت کہاں تھا کہ اپنے فدائیوں کی رسوائی دیکھتا رہا۔ اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ غضب الٰہی نے اسی وقت یزید اور یزید کے درباریوں پر بجلی گرادی ؟

کیا فرماتے ہیں ہستیِ موہوم کا کلمہ پڑھنے والے اس باب میں کہ بنی اسرائیل چیختے رہ گئے کہ اے موسیٰ، تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنے خدا کو سامنے لاؤ، مگر جب جوش میں آکر موسیٰ نے نقاب پھاڑنا چاہا تو ان کا خیالی نقاب پوش للکار اُٹھا کہ دور باش! حضرت موسیٰ کی اس شکست فاش کے بعد اب کس کا منہ ہے کہ خدا کی ہستی کا دعویٰ کرے ؟ مدعی سست اور گواہ چست! اگر خدا تھا تو بنی اسرائیل کے سامنے کیوں نہ آیا؟ اور اب بھی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتا ؟

(۲)

کلمہ گو نے دہریئے سے کہا کہ ہم تیری باتوں کا جواب یوں دیں گے کہ کسی مدرسہ میں چند طلباء اُردو زبان سیکھتے تھے، صرف ونحو اور بالخصوص فن عروض کی بیسیوں کتابیں درس میں تھیں سالانہ امتحان میں جب طلباء شریک ہوئے اور اُردو کا پرچہ سامنے آیا تو اس میں سوال تھا کہ :-

مندرجۂ ذیل الفاظ میں املا کی جو غلطیاں ہوں ان کو درست کرکے غیر مرتب الفاظ سے ایک شعر کہو :-

ذو - صغد - دیکھے - کہ - حم - حے - بے - کور - کر - کو - مادر - یح

بلغیب - کیا - مانیں گے - چلطے - یکیں - نہیں - اوص - ہیں - رکھ

اس سوال کو دیکھ کر طلباء نے قہقہہ مارا اور یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے کہ یارو! اگر ہمیں مکتب وہمیں ملا، کار طفلاں تمام خواہد شد۔ قافیے کا پتہ نہیں، ردیف کا پتہ نہیں، بحر کا پتہ نہیں، مضمون کا پتہ نہیں، الفاظ کی بے سروسامانی یہ ہے جیسے میدانِ جنگ سے بھاگتی ہوئی فوج کا توشہ خانہ۔ پھر فرمایش یہ ہے کہ شعر کہو، یا تو سوال چلنے والا پاگل ہے۔ یا نہیں تو کوئی جنّاتی مذاق ہے، ایسے ہذیان کا جواب دینا عقلمندوں کا کام نہیں ہے۔

ہو بہو یہی حالت منکرین خدا کی ہے، طلباء نے اُردو کے پرچے کو ہذیان سمجھ کر اس کا جواب دینا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور دہریوں نے خود اپنی ہستی کو ارتقائی ہذیان سمجھ کر خدا کی ہستی سے انکار کردیا۔ مگر طلباء اگر صبر سے کام لیتے تو ان کو معلوم ہوجاتا کہ املا کی غلطیاں صرف نو ہیں۔ (ذو - صغد - حم - حے - یح - بلغیب - چلطے - یکیں - اوص، بن کی صحت کی جائے تو الفاظ یہ ہوں گے :- "سند - زاد - ہم - ہے - یہ - بالغیب - چلتے - یقین - اوس" باقی - بغیر مرتب الفاظ کی ترتیب دینا تو گھڑی ساز کی دوکان میں سیکڑوں پرزے منتشر رہتے ہیں مگر وہ آناً فاناً میں سب کو ترتیب دے لیتا ہے اسی طرح ناظم، کا پیشہ یہی ہے کہ خیالات کی منتشر فوج کو بروقت ترتیب دیا کرے۔ اس کے لئے مشکل نہیں کہ چند منتشر الفاظ کو ترتیب دے کر ایک شعر نظم کرتے، پس طلباء کا امتحان اسی بات کا تھا کہ وہ فن عروض کی کنگھی سے اس زلفِ پریشاں

---

[1] ہسٹری آف سریسن مصنفہ جسٹس امیر علی صفحہ ۲۹۸ - [2] انجیل -

کو سلجھا سکتے ہیں یا نہیں، قہقہہ نے سب کام بگاڑ دیا ورنہ غیر مرتب الفاظ کو مناسب ترتیب دینے سے جو شعر ہوتا وہ یہ ہے ؎

یہ کیا ضد ہے کہ بے دیکھے نہیں مانے گے اُدس کو ہم یقیں بالغیب رکھ کر کور مادر زاد چلتے ہیں

یعنی عجائب خانہ میں رکھنے کے قابل وہ بچہ ہے جو دونوں آنکھوں سے اندھا پیدا ہوا، کیونکہ اس کی زندگی کا ہر ورق گلستانِ سعدی سے زیادہ سبق آموز ہے، ماں، باپ کی صورت، زمین آسمان کی صورت، اپنے مکان کے در و دیوار کی صورت، بستی والوں کی صورت، آگ مٹی اور پانی کی صورت، آج تک اس نے دیکھی نہیں، پھر بھی نادیدہ ہر شے کا اس کو یقین ہے، آگ کو مٹی نہیں سمجھتا، مٹی کو پانی نہیں سمجھتا، اور پانی کو آگ نہیں سمجھتا، کبھی وہ عذر نہیں پیش کرتا کہ ماں کو ماں، باپ کو باپ کیوں مانیں، جبکہ آج تک ہم نے ان کو دیکھا نہیں ہے، سڑکوں پر نکلتا ہے تو اس کا ہر قدم یقین بالغیب کا نتیجہ ہے۔ نشیب و فراز سے بچتا ہوا جاتا ہے اس لئے نہیں کہ نشیب و فراز آنکھوں سے دیکھ رہا ہے بلکہ اس لئے کہ اپنے عصا اور راستہ بتانے والوں کو وہ جھوٹا نہیں سمجھا۔ کسی نے ٹوک دیا کہ آگے کنواں ہے تو یہ سنتے ہی وہ اپنا رخ بدل دیتا ہے، حجت نہیں کرتا، منطق نہیں شروع کر دیتا۔ پس ایک کور مادر زاد کی زندگی شاہد ہے اس بات کی کہ کسی چیز کا ماننا اس چیز کے دیکھنے پر منحصر نہیں ہے۔ ایک مریض کہتا ہے کہ میرے بدن میں درد ہے طبیب اس درد کو دیکھ نہیں سکتا، مگر نادیدہ پر یقین رکھتا ہے اور درد کی دوا دیتا ہے۔ اسی طرح سقراط، رستم حاتم طائی، بابل و نینوا کے شاہی محلات، پانی پت کی لڑائیاں، لیلیٰ مجنوں کا مکتب میں الف بے پڑھنا، بابر کا ہمایوں پر صدقے ہو کر مرجانا، ہارون کا کبیس بدل کر راتوں کو نکلنا، سکندر کی تلوار خوں آشام، فرہاد کا تیشہ، بت شکن محمود کا نعرۂ اللہ اکبر، نمرود کی سرکوبی کرنے والا مچھر اور امیر علی ٹھگ کا رومال، یہ سب چیزیں، یہ سب لوگ، یہ سب مناظر، قبرستانِ ماضی میں آج مدفون ہیں، کوئی ان کو دیکھتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے مگر نادیدہ سب کو یقین ہے! کوئی یہ عذر پیش نہیں کرتا کہ پانی پت کی لڑائی اور فرہاد کا تیشہ جب میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تو ہم ان کو مانیں کیوں؟ مگر ہاں، جب خدا کے ماننے کی باری آتی ہے تو بنی اسرائیل، کفار مکہ اور دہریے چیخ اٹھتے ہیں کہ واہ واہ جب اس کو دیکھا نہیں تو مانیں کیوں؟ مگر یاد رہے کہ کوہ طور پر صدا یہی آئی تھی کہ "لن ترانی"! اور کفار مکہ کو جواب یہی ملا تھا کہ ہم کو دیکھنا ہو تو "ہماری نشانیاں" دیکھ لو۔ خاک کو عالمِ پاک سے یا مخلوق کو خالق سے۔ کوئی نسبت نہیں، مگر یہ کیا ہے کہ مخفی زیب النساء کے نادیدہ عاشقوں نے جب اس کی زیارت چاہی تھی تو [illegible] بھی صاف کہہ دیا تھا کہ "ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن ہیندمرا!"

۹۶۳ھ کا تاریخی واقعہ ہے کہ شہنشاہ اکبر جب کشمیر گیا تو وہاں شاہ عارف[1] حسینی سے ملاقات ہوئی، شاہِ عارف ہمیشہ نقاب پوش رہتا تھا، اس لئے اکبر نے ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح گیلانی کو اس کی خدمت میں بھیجا، دونوں نے پہونچ کر عرض کی، "شاہا! کیا مناسب ہے اگر نقاب اٹھا دو ہم بھی تمہارا جمال دیکھ لیں" عارف حسینی نے نہ مانا اور کہا:۔ "ہم فقیر لوگ ہیں، جانے دو، بہت مت ستاؤ" حکیم ابوالفتح گیلانی شوخ و بیباک تھا، ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ نقاب کھینچ لے، شاہ عارف حسینی اس گستاخی پر جامہ سے باہر ہو گیا اور بولا:۔ "میں مخدوم یا معیوب نہیں، لے دیکھ میرا منھ" مگر نتیجہ اسی دو ہفتہ میں دیکھ لے گا" یہ کہہ کر نقاب پھاڑ کر پھینک دیا، ابھی دو ہفتہ بھی نہ گزرے تھے کہ کشمیر سے واپسی میں ابوالفتح گیلانی دردِ شکم اور اسہال میں گرفتار ہو گیا، اکبر کا ماتھا ٹھنکا، شاہ عارف حسینی کا غصہ دھیما کرنے کے لئے کچھ روپے بھیجے کہ تبت کے محتاجوں میں تقسیم فرما دیجئے مگر یہ پیش بندی کچھ کام نہ آئی اور مرض اتنا بڑھا کہ ابوالفتح گیلانی نے راستہ ہی میں انتقال کیا تاریخ وفات نکلی تو یہ نکلی کہ "خدایش مزا دہاد" ۹۹۷ھ

پس جب زیب النساء اور شاہ عارف حسینی کے جیسے خاک نشینوں کا دماغ یہ تھا کہ اپنے تماشائیوں کو مستحق دیدار نہ سمجھا تو پھر جو واقعی جانعالم ہے، بے نیاز ہے، یگانہ و یکتا ہے، جسم و مکان کے قیود سے مبرا ہے، ہر اول سے اول ہے، ہر آخر سے آخر ہے، "لم یلد ولم یولد" ہے۔ خود آپ ہے۔ وہ ہم خاک نشینوں کو مستحق دیدار کیوں سمجھے؟ اور سمجھے بھی تو یہاں طاقتِ دیدار کس میں ہے؟ اسی لئے طالبِ دیدار کی تنبیہ کے لئے دنیا میں کور مادر زاد بھیجا گیا، کیونکہ اس کی زندگی کی پوری عمارت صرف ایمان بالغیب پر کھڑی ہے اور عمارت زندہ گواہ ہے اس بات کی کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی شے کو کیونکر مانا جا سکتا ہے! اگر خدا کا ماننا اس کے دیکھنے پر منحصر ہوتا تو دنیا میں جتنے اندھے ہیں ان کو معافی کا پروانہ مل جاتا، وہ یہ

---

[1] دربار اکبری صفحہ ۶۶۱ - ۶۵۹

منطق پیش کرتے کہ ساری دنیا خدا کو مان رہی ہے تو آنکھ سے دیکھ کر مانتی ہے، میرے پاس جب آنکھ ہی نہیں تو ہم کیونکر دیکھیں اور کیونکر مانیں؟ اس منطقی عذر سے بچنے کے لئے اگر خدا ساری دُنیا کو آنکھیں دیدیتا یعنی کسی کو اندھا نہ پیدا کرتا، اور خود اپنے آپ کو فضائے آسمانی میں چاند سورج کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے معلق کر دیتا تاکہ ساری دُنیا ہر وقت اس کو دیکھتی رہے اور انکار کا موقع کسی کو نہ ہونے پائے تو بھی ان تمام لوگوں کو معافی کا پروانہ مل جاتا جو کور مادر زاد نہ تھے، مگر بعد میں چوٹ کھا کر یا امراض کی وجہ سے یا بڑھاپے میں اندھے ہو گئے، ان میں سے ہر شخص یہ اعلان کر دیتا کہ کل تک ہم خدا کو دیکھتے تھے اس لئے مانتے تھے آج دیکھ نہیں سکتے اس لئے مان نہیں سکتے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا کو ہم دیکھنا بھی چاہیں تو کس طرح دیکھیں؟ رنج، راحت، سردی، گرمی، نیکی بدی، وقت، روح، درد، غصہ، رحم ستم کی شکل و صورت آج تک کس نے دیکھی ہے؟ صرف آثار و نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ جو مچھلی جال میں تڑپ رہی ہے اس میں ابھی روح ہے اور جو تڑپ کر سرد ہو چکی ہے اس میں اب روح نہیں ہے، مگر روح بذاتِ خود کیا ہے، یہ انسانی آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھا، جب روح کی لطافت و نزاکت یہ ہے تو روح کا پیدا کرنے والا اپنے کو دکھاتا تو کس طرح دکھاتا۔ اور ہم دیکھتے تو کس طرح دیکھتے؟ کیا ان آنکھوں سے جو شیر کے سامنے جھپک جاتی ہیں؟ کیا ان آنکھوں سے جو مہر نیمروز کے سامنے خیرہ ہو جاتی ہیں؟ کیا ان آنکھوں سے جو کوہِ طور پر ایک نظر غلط انداز تک سے شکست کھا گئیں؟ یہی جواب ہے میرا، تیرے اس سوال کا کہ اگر خدا تھا تو بنی اسرائیل کے سامنے کیوں نہ آیا۔ اور اب بھی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتا ؎

جو دکھلائیں تو غش ہوں سب نہ دکھلائیں تو منکر ہوں وہ یکتائی پہ اپنے حُسن کی، خود ہاتھ ملتے ہیں،

یہی وجہ ہے کہ آسمانی کتابوں نے اعلان کر دیا کہ چشم ظاہر خدا کو دیکھ نہیں سکتی، جس کو دیکھنے کی تمنا ہو وہ چشم باطن سے اس کو دیکھ لے حسرتِ دیدن پوری کیونکر ہو جب آلہ دیدن ہی ناقص ہے، اس لئے مجبوراً اس آلہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے آلہ سے کام لینا ہوگا اور وہ دوسرا آلہ وہی چشم باطن و گوشِ باطن ہے، جس کی طرف تمام الہامی کتابیں اشارہ کر رہی ہیں کہ کاتب کو دیکھنا ہو تو اس کا مکتوب دیکھ لو۔ مگر اس نابینائی کا کیا جواب ہے کہ دہریوں نے جب مکتوب دیکھا تو خبط ہو گئے اور خبطگی میں چلا اُٹھے کہ بھائیو! یہ مکتوب سراسر ہذیان ہے، اور ایسے کاتب کو ماننا ہم لوگوں کی شان کے قطعی خلاف ہے، جب پوچھا کہ ہذیان کیونکر ہے تو کہنے لگے کہ کاتب نے زہرہ بائی کو چشم غزالاں دیکر فاتح اور شریفن کو چشم کور دے کر مفتوح کیوں کیا؟ اور خانۂ کعبہ کو ابرہہ کے چنگل سے بچانے کے لئے اگر ابابیلوں کی فوج کو بھیجنا ضروری تھا، تو وہی فوج ابو طاہر کی سرکوبی کے لئے کیوں نہ بھیجی گئی، جب وہ بیت اللہ کو تاراج کر رہا تھا؟ مگر یاد رہے کہ سالانہ امتحان دینے والے طلبا بھی اُردو کے پرچے کو ہذیان سمجھ کر قہقہہ مارتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، حالانکہ وہ سوال ہذیان نہ تھا بلکہ غلط املا اور غلط ترتیب قصداً تھی۔ قصداً اسلئے کہ ممتحن کو اسی بات کا امتحان لینا تھا کہ ان غلطیوں کو درست کر کے کون کون صحیح جواب دیتا ہے اور سوال کو ہذیان سمجھ کر کون کون اُٹھ جاتا ہے، اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! یہ قفس دنیا بھی دارالامتحان ہے، اشرف المخلوقات کا امتحان ہو رہا ہے، اور اق زمین و آسمان اور اس مجموعۂ منتشر کے تمام مکتوبات امتحان کے سوالات ہیں اور ان سوالات میں بھی جا بجا املا کی غلطیاں اور الفاظ کی بے ترتیبی قصداً چھوڑ دی گئی ہیں، املا کی غلطیاں یہ ہیں کہ ممتحن نے کسی کو اندھا پیدا کیا، کسی کو گونگا بہرا، کسی کو اپاہج، کسی کو بونا، کسی کو دیوانہ، کسی کے ہاتھ گھٹنوں تک پہونچا دئے، کسی کے ہونٹ الٹ دئے، کسی کی ناک چپٹی کر دی، کسی کی گردن کوتاہ کر دی، اور کسی کے کان دراز کر دئے۔

عمر خیام کہتا ہے کہ ماہ صیام کے تمام ہونے پر جب اور لوگ عید کا چاند دیکھ رہے تھے، اس وقت ہم ایک کمہار کی دوکان پر کھڑے تھے، سامنے طرح طرح کے مٹی کے پیالے سجے رکھے تھے، اتنے میں ایک پیالہ پوچھ بیٹھا کہ بھائیو! کوزہ کون ہے اور کوزہ گر کون ہے؟ دوسرے پیالے نے جواب دیا کہ خاموش! کیا تم سمجھتے ہو کہ کمہار نے کھیت روندی ہوئی مٹی گوندھ کر اپنی تمام صناعی اس پر اس لئے صرف کی ہے کہ اس عجیب و غریب پیالہ کو توڑ کر پھر کھیت کی مٹی کر دے؟ ہرگز نہیں۔ تیسرے پیالے نے کہا کہ "لاریب! کوئی کیسا ہی شوریدہ مزاج ہو مگر یہ نہیں کرے گا کہ جس جام سے بادۂ عشرت پی چکا ہو اس جام کو دے پٹکے، تب کمہار پر اس بات کا شبہ کیوں ہے کہ جن پیالوں کو خود اپنا دل بہلانے کے لئے اس

شوق و محبت سے وہ بنا چکا، انھیں پیالوں کو بعد میں جھنجھلا کر وہ چکنا چور کر دے گا۔ یہ سنکر اور پیالے تو خاموش ہو گئے مگر ایک بدصورت پیالہ بول اٹھا کہ "بھائیو! تم لوگ خوبصورت ہو، تمھارے گاہک ایک نہیں ایک لاکھ، مگر ہم ایسے بھونڈوں کو کون پوچھے، دنیا ہم پر ہنستی ہے، خدارا بتاؤ کہ ہم کو بناتے وقت کیا کمہار کے ہاتھوں میں رعشہ تھا؟ اگر کمہار کا ہاتھ اس وقت تھرایا نہیں تھا تو ہم بدصورت کیوں ہو گئے؟" کمہار کی دوکان میں جو بحث چھڑی تھی اس کا جواب امیر مینائی یوں دیتا ہے ؎

شبیہ مد نظر ہے کس کی؟ کہ کوئی صورت نہیں اُترتی مٹا دئے صانع ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

یعنی روزِ آفرینش سے آج تک اتنی تصویریں جو خاک میں ملائی گئیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ مصور کی مرضی کے مطابق آج تک کوئی تصویر اُتری ہی نہیں، مصور غریب ابھی مشق کر رہا ہے، ہر صبح قلم ہاتھ میں لیتا ہے اور ہر شام کاغذ کو جھنجھلا کر پھاڑ دیتا ہے! عمر خیام کی یہ رندانہ جرأت کہ پیالہ جب ٹیڑھا کبڑا ہے تو ضرور کمہار کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور امیر مینائی کی یہ شاعرانہ جودت کہ تصویریں جب ہر صبح و شام پھاڑ کر پھینکی جا رہی ہیں تو ضرور مصور اپنے فن میں ابھی کچا ہے، یہ دونوں شان ایزدی میں سراسر گستاخیاں ہیں، کیونکہ بھول چوک، ہاتھ کانپ جانا، خیال بٹ جانا، تصویر ٹھیک نہ اُترنا۔ ان الفاظ کا اطلاق صاحبِ کن فیکون کی ذات پر ہو ہی نہیں سکتا ؎

دہد نطفہ را صورتے چوں پری کہ کردہ است بر آب صورت گری

پس تصویر اگر بھونڈی ہے، تو قصداً بھونڈی ہے، اور پیالہ اگر ٹیڑھا ہے تو قصداً ٹیڑھا ہے۔ قصداً اس لئے کہ مصور اور کمہار کو امتحان لینا منظور ہے، زہرا بائی کی طرح شریفن کو بھی وہ چشم غزالاں دے سکتا تھا، مگر قصداً نہیں دیں تاکہ اسی کے ذریعہ سے فرزندان آدم کا امتحان ہو جائے، چنانچہ اس امتحان کے لئے جب شریفن و زہرا بائی بیک وقت دنیا کے سامنے پیش ہوئیں تو ظاہر پرست نے باعصمت کو ٹھکرا دیا اور فاحشہ کو گلے لگایا۔ ہرن کے شکار کے پیچھے ایک اندھی کو چل ڈالا۔ حالانکہ وہ اندھی فرزندانِ آدم کے رحم و کرم کی زیادہ مستحق تھی، بہ نسبت اسکے جو چشم غزالاں رکھتی تھی! اس غلط املا کو کسی نے درست نہ کیا، آنکھ والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ شریفن کی طرح ہمیں اندھے پیدا کئے جاتے تو اسوقت کیا ہوتا، اور یہ کہ آنکھیں جب ہم کو دی گئی ہیں تو اس شکرانۂ نعمت میں ہم کو دنیا کے تمام نابیناؤں پر لطف و کرم کرنا چاہئے یا نہیں۔ فرزندانِ آدم نے جب نابینا شریفن کو ٹھکرا دیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس خاص امتحان میں سب کے سب ناکام ہوئے، مگر خود شریفن کے امتحان کی جب باری آئی، یعنے اندھے ہونے کے جرم میں جب کسی نے اس سے عقد نہ کیا تو اس وقت اس نے گمراہی پر فاقہ کو ترجیح دی۔ اور عصمت بیچ کر کبھی منہ ہی نہ لگائی — "ان اللہ مع الصابرین"۔ اس لئے شریفن اس امتحان میں کامیاب رہی — اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! اس دارالامتحان میں جتنے اپاہج، اندھے، لولے، لنگڑے، دیوانے اور بدصورت ہیں، سب کے سب امتحان کا ایک ذریعہ ہیں، جو اپاہج پیدا کئے گئے، ان کے صبر و تسلیم کا، اور جو تندرست اور صاحبِ جمال پیدا کئے گئے ان کے لطف و کرم اور انکسار کا، بیک وقت امتحان ہو رہا ہے اس امتحان کی سرگزشت شیراز کا ایک طالبِ علم[1] یوں بیان کرتا ہے — "ہرگز از دور زماں نالیدہ ام و ردے از گردشِ ایام در ہم نہ کشیدہ مگر وقتیکہ پایم برہنہ بود و استطاعت پائپوشی نہ داشتم، بہ جامع کوفہ در آمدم دل تنگ، یکے را دیدم کہ پائے نہ داشت۔ سپاس نعمتِ حق بجا می آوردم و ببرہنہ کفشی صبر کردم!" — ننگے پاؤں پھرنے کی شکایت کیوں کی جائے جب اوروں کے پاس پاؤں ہی نہیں۔ مگر اسی آزمائش میں فرزندانِ آدم کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں — "آوردہ اند کہ فقیہہ دختر داشت بہ غایت زشت رو، بجائے زنان رسیدہ باوجود جہاز نعمت، کسے در مناکحت او رغبت نہ می کرد فی الجملہ بہ حکم ضرورت باضریرے (نابینائے) عقد نکاحش بستند۔ و آوردہ اند کہ حکیمے در آں تاریخ از سراندیپ آمدہ بود کہ دیدۂ نابینا را روشن ہمی کرد۔ فقیہہ را گفتند چرا داماد خود را علاج نہ کنی؟ گفت، ترسم کہ بینا شود دختر را طلاق دہد!" — اس فقیہہ کو تجربہ ہو چکا تھا کہ لڑکی سن بلوغ سے کوسوں آگے بڑھ گئی مگر بدصورتی کے جرم میں دنیا نے اس کو پوچھا نہیں، خدا خدا کر کے ایک نابینا داماد ملا۔ تو وہ داماد کہاں کا ایسا خدا ترس و خدا شناس تھا کہ آنکھیں پاکر اپنی منکوحہ سے وہی سلوک نہ کرتا جو آنکھ والی دنیا کر چکی ہے؟ اس لئے اندھے داماد کو زندگی بھر اندھا ہی رکھنا خوب تھا۔

---

[1] گلستاں باب دوم

الغرض جس طرح املا کی غلطیاں قصداً ہیں اسی طرح الفاظ کی بے ترتیبی بھی قصداً ہے ممتحن نے اپنے سوالات میں الفاظ کی بے ترتیبی یہ رکھی ہے کہ ابرہہ کی شکست کے لئے ابابیلیں بھیجیں مگر ابوطاہر کو سنگ اسود اکھاڑنے دیا، جناب عیسیٰ ابن مریم کو طمانچے کھانے کے لئے خاتم النبیینؐ کو کانٹوں پر چلنے کے لئے اور امام الصابرین حسینؑ ابن علیؑ کو ریگ تفتہ پر ذبح ہونے کے لئے چھوڑ دیا، مگر فراعنۂ مصر کو صدیوں تک تختِ مصر کی حکمرانی نصیب فرمائی، ایک بچہ کو بادشاہ کے گھر پیدا کیا دوسرے کو فقیر کے گھر میں، ایک کو متقی کے گھر میں، دوسرے کو ٹھگ کے گھر میں، ایک کو طوفان کی گود سے بچا لیا اور دوسرے کو شفاء الملک کی گود سے چھین لیا ۔

حسن زبصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم زخاکِ مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبی است ،

مگر اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! بساط شطرنج پر مہروں کی ترتیب صرف کھیل کے پہلے درست رہتی ہے، کھیلتے وقت وہ ترتیب کہاں؟ بازی جس وقت شروع ہوگئی اس وقت پیادوں کی قطار اور شاہ کے مصاحبین یمین و یسار کی صف بندی ناممکن ہے! کھیل کے وقت فرزیں کے داہنے کبھی پیادہ ہے اور کبھی رخ، رخ کے بائیں کبھی پیل ہے اور کبھی اسپ۔ اور اسپ کبھی بازی کو زیر و زبر کر رہا ہے اور کبھی خود نیستی کی خدمت میں پیش ہوگیا۔ اسی طرح "انی جاعلٌ فی الارض خلیفہ" کے اعلان کے بعد جب بساط کونین پر مہرے چلنے شروع ہوگئے تو اب وہ اگلی ترتیب و صف بندی کیونکر قایم رہتی؟ شجر ممنوعہ والی جنت میں ہرگز ایسا نہ تھا کہ ایک اپاہج و نابینا ہو اور دوسرا تندرست و توانا۔ ایک گدائے فاقہ کش ہو اور دوسرا صاحبِ تاج و تخت۔ ایک اسماعیل ذبیح ہو اور دوسرا اہلاکو خاں۔ اس جنت میں جو تھے وہ ہم پلہ و ہم سنگ تھے! مگر ہاں جس دن وہ جنت چھن گئی اور مشیت ایزدی نے آدم و حوا کو دارالامتحان میں بھیجدیا، اسی دن سے وہ تمام بے ترتیبیاں قصداً شروع کردی گئیں جو آزمائش کے لئے اشد ضروری سمجھی گئیں۔ اجتماع ضدین اور بے ترتیبی آزمایش کے لئے اگر اشد ضروری نہیں ہے تو فرعون کی داڑھی جب اس کے متبنیٰ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے نوچی تھی اور اس نوچنے پر اس کو شبہ ہوا تھا کہ یہ بچہ کہیں وہی تو نہیں ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے خبر دی تھی کہ میرا خاتمہ کردے گا، اور اس لئے جب فرعون نے اس بچہ کا امتحان لینا چاہا تو اس نے ایک تھالی میں آتشیں لعل اور دوسری تھالی میں جلتے ہوئے انگارے اس بچہ کے سامنے کیوں رکھے تھے، یقیناً اسی آزمایش کے لئے رکھے تھے کہ بچہ اگر فہمیدہ ہے تو انگاروں کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے گا اور اگر واقعی ناسمجھ ہے تو انگاروں کو ہاتھ میں لے لیگا۔ اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! پھر یہ کیا ہے کہ اس دارالامتحان میں اجتماع ضدین کو دیکھ کر تو چیخ اٹھتا ہے کہ اگر خدا ہوتا تو اس قسم کی بدنظمی کیوں ہونے پاتی؟ تیری باتیں ملک الشعراء[1] سے ملتی جلتی ہیں جو ایک مرتبہ خود مرض چشم میں گرفتار ہوا تو عرق کی چند بوتلیں لے کر دوکان کھول بیٹھا اور تختی لٹکا دی کہ "یہاں آنکھوں کا علاج ہوتا ہے، قیمت فی شیشی ایک آنہ" اتفاقاً ایک پردیسی مریض اس دواخانہ میں داخل ہوا تر ملک الشعراء کی آبلی ہوئی خون کبوتر آنکھوں کو دیکھ کر اس نے ایک شیشی عرق کے لئے دو آنے پیسے دئے۔ ملک الشعراء نے جھنجھلا کر کہا، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ ایک شیشی عرق کی قیمت صرف ایک آنہ ہے؟ خریدار نے جواب دیا کہ "ایک آنہ زائد اس لئے ہے کہ حضور بھی اپنی دکان سے ایک شیشی خرید لیں اور اپنی آنکھوں کا علاج کرلیں!" ۔ معلوم نہیں ملک الشعراء نے اس ایک آنہ پیسہ سے اپنی آنکھوں کا علاج کیا یا نہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ دہریوں نے آج تک اپنی آنکھوں کا علاج نہیں کیا۔ منطق یہ پیش ہوتی ہے کہ خدا ہوتا تو سامنے ضرور آتا، جب کہا گیا کہ سامنے آنے کی وہ چیز نہیں اور تم حضوری کے قابل نہیں تو عذر یہ ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے کیونکر مانیں، جب یہ کہا گیا کہ نقش پا دیکھ کر پہچان لو، تو کہنے لگے کہ یہ نقش، نقشِ برآب ہے، فرضی ہے، موہوم ہے، اُلٹا سیدھا ہے، بالکل بے ربط ہے۔ یہ کیا کہ حضرت عیسیٰ طمانچے کھائیں اور فرعونی کے تختِ مصر پر لوٹیں!؟

کلمہ گویوں کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی بے ترتیبی و بے ربطی قصداً ہے، کیونکہ انکار سجدہ کے بعد سے جب شیطان ہمیشہ اسی دھن میں ہے کہ آج رشوت دے کر فرزندانِ آدم کو کسی طرح اپنا کرلو، تاکہ کل یہ کہنے میں آئے کہ ایسے کم ظرفوں کو سجدہ نہ کرنا ہی خوب تھا، تو ایسی حالت میں مشیت

---

[1] اورنیل بائی گرانی مولفہ مسٹر ہیل۔ مطبوعہ لندن ایڈیشن پہلا صفحہ ۲۷۰ - ۲۸۰۔ ملک الشعراء کا تخلص شیخی تھا۔ سلطان مراد اول (آلِ عثمان) کے دربار میں تھا۔

ایزدی نے بھی یہی چاہا کہ فرزندان آدم شیطان کی رشوت قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ خود ہی کرلیں، نسل آدم اپنے اعمال و افعال میں خود مختار چھوڑ دی گئی ہے پرندوں کی طرح ہم فضائے آسمانی میں اُڑ نہیں سکتے، مگر دارالامتحان کی سرزمین پر جس طرف چاہیں جا سکتے ہیں اور خانۂ دل میں جس قسم کے خیالات کو جگہ دینا چاہیں دے سکتے ہیں، اگر نسل آدم اپنے افعال میں مجبور کی جاتی تو پھر میزان محشر اور تخلیق بہشت و دوزخ کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ مجبوروں سے باز پرس کرنا صریح ظلم ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ لڑکے جو سن تمیز کو نہ پہونچے ہوں، یا وہ لوگ جو اپنے حواس میں نہ ہوں، قیود مذہب سے آزاد کردئے گئے ہیں ان کے علاوہ ہر شخص اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے کیونکہ ہر شخص آزاد ہے، اس دارالامتحان میں دیر و حرم کے دروازوں پر ایک ایک تختی لٹکی ہوئی ہے، دیر کی تختی پر باب جہنم کندہ ہے، راستہ چلنے والوں کے پاؤں بالکل آزاد کردئے گئے ہیں، کسی کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ہیں، جس کو جس طرف جانا ہو جا سکتا ہے، مگر کس طرف جانا چاہئے، اس کا اشتہار ہمیشہ ہوتا رہا ہے، عرش نشیں کی سرکار سے ہزاروں قاصد زبانی اور تحریری پیام لا چکے ہیں، گلی گلی منادی کردی گئی ہے، اس اعلان کے بعد بھی ابوجہل حرم کو چھوڑ کر دیر کی طرف جائے تو اس کی ذمہ داری خود ابوجہل پر ہے نہ کہ اللہ یا اس کے رسولوں پر۔ دہریوں کا اعتراض ہے کہ ابوجہل اگر دیر کی طرف جا رہا تھا تو اللہ میاں نے اپنے بندے کو شیطان کے پنجے سے زبردستی چھڑا کیوں نہیں لیا۔ گلہ بان کیسا ہے کہ بکریاں شیر کی طرف جا رہی ہیں اور وہ لاٹھی کے زور سے بکریوں کو روکتا نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پسر نوح کو اگر گود میں اُٹھا کر زبردستی کشتیِ نوح پر بٹھلا دیا جاتا تو پھر امتحان، امتحان نہیں باقی رہتا، امتحان لینے والے کو یہی تو دیکھنا مقصود ہے کہ کون کون برضا و رغبت اس کی طرف آتا ہے اور کون کون دیدۂ و دانستہ ابلیس کی طرف جاتا ہے، "لا اکراہ فی الدین!" یہی وجہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اتمام حجت کے لئے بہ تکرار آواز دی کہ بیٹا! میری کشتی پر اب بھی چلا آ، شیطان کی رشوت مت لے، مگر بیٹے نے کشتی پر آنے سے جب قطعی انکار کردیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے بھی خموشی اختیار کرلی، حضرت نوح اس وقت سرکاری کام میں تھے، سرکاری حکم یہی تھا کہ جو شخص اپنی خوشی سے تمہاری کشتی پر نہ آئے اس کو زبردستی مت بٹھلانا، اگر یہ حکم نہ دیا جاتا اور پسر نوح کو شیطان کے پنجے سے چھڑا کر جبریہ کشتی میں سوار کردیا جاتا تو پھر عبدیت و بغاوت میں کوئی امتیاز باقی نہ رہتا، دودھ میں مکھی پڑ جاتی اور معصومیت کو معصیت کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھنا پڑتا، امتحان کے وقت جبر و تشدد ہو نہیں سکتا، اگر ہو سکتا ہے تو شداد ابن عاد جس وقت معماروں سے اول اول باغِ ارم کی فرمائش کر رہا تھا اسی وقت اس سے جبریہ توبہ کرائی جاتی، یا فوراً روح قبض کرلی جاتی، مگر ان دونوں صورتوں میں امتحان ادھورا رہ جاتا۔ جبریہ توبہ سے امتحان کی اصل غایت اس لئے فوت ہوتی کہ بہت فرق ہے اس کتے میں جو اپنے مالک کی آہٹ پاکر خود بخود اس کے پاس دوڑا جاتا ہے اور اس بکری میں جو لاٹھی اور گلے کی رسّی کے زور سے قصاب کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ اور فوری قبض روح کا حکم دیا جاتا تو دنیا شکایت کرتی کہ باغ ارم کا محض خیال ظاہر کرنا اور چیز ہے، باغ کا تعمیر کرنا اور چیز ہے، غریب شداد نے اپنے خیال پر ابھی عمل کہاں کیا تھا کہ اس کی روح قبض کرلی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ شداد نے اپنے کفرانِ نعمت کی اور ہمارے اللہ نے اپنے امتحان کی جب تک تکمیل نہ کرلی اسوقت تک قبض روح کا حکم نہیں دیا گیا۔ ان دونوں باتوں کی تکمیل اسوقت ہوئی جب خدائی کا دعویٰ کرنے والا شداد باغ ارم کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا۔

اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! ہمارے خدا نے شداد کو طوفان کی گود سے بچا کر اور سیٹھ کروڑی چند کے نوزائیدہ کو شفار الملک کی گود سے چھین کر دہریوں کے منہ پر دو طمانچے لگائے ہیں۔ کیا بات تھی کہ شفار الملک کا علم سینہ و سفینہ، اور سیٹھ کا گنجِ فراواں جسم و روح میں وصل قایم نہ رکھ سکا "اشہد ان لا الہ الا اللہ"! قادر مطلق کی قدرت کا نظارہ جس کو کرنا ہو وہ اول کی بقا اور ثانی کی فنا دیکھ لے، باقی رہا یہ اعتراض کہ ہمارا اللہ جب رحیم ہے تو اولاد سیٹھ کے بگڑ میں ناسور کیوں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ "گندم از گندم بروید جو ز جو"۔ سیٹھ کہتا پھرتا ہے کہ میرے دھرم میں جیو مارنا اس قدر پاپ ہے کہ کھٹمل بھی ہم کو کاٹے تو ہم اس کو ماریں نہیں بلکہ اٹھا کر باہر پھینک دیں، کیونکہ اپنی زبان کے چٹخارے کے لئے بے زبانوں کا ذبح کرنا خاص مسلمانوں کی شان ہے، مگر رحم دل سیٹھ کا دھرم دیکھنا ہو تو اس کا بہی کھاتہ دیکھ لو کہ کس طرح قتل عام ہو رہا ہے۔ دیکھ لو کہ سود در سود کی شمشیر بے نیام سے کس طرح ہزاروں لاکھوں کے سر قلم ہو رہے ہیں، کس طرح یتیموں، بیواؤں، فاقہ کشوں اور دیگر قرض خواہوں کی قبریں کھود کر رحم دل سیٹھ ان قبروں پر جا بجا مندر اور دھرم شالے بنوا رہا ہے، اور دیکھ لو کہ خود اپنے گھر میں چراغ جلانے کے لئے

کس طرح وہ ایک جانشین کی تمنا کر رہا ہے، ایسے مکّار قاتل کی سزا اگر یہ کی گئی کہ جانشین گود میں بٹھلا کر چھین لیا گیا تو اس میں ظلم کیا ہوا؟ سیٹھ نے خلق اللہ پر ظلم کیا اور خلق اللہ کی آہ نے سیٹھ کی گود سے اس کا بچہ چھنوا لیا، کیونکہ اسی بچّہ کے لئے سیٹھ دولت جمع کر رہا تھا۔

ہمارے اللہ کا قانون عدل و انتقام دیکھنا ہو تو دیکھ لو کہ مزدوروں اور فاقہ کشوں کے جھونپڑوں میں نعمتِ اولاد کی یہ فراوانی ہے کہ وہاں پاؤں پھیلا کر کوئی سو نہیں سکتا اور اغنیاء اور بادشاہوں کے محلات میں بچّوں کا یہ قحط کہ جانشینی کے لئے زیادہ تر غیروں کے بچے گود لئے جاتے ہیں ہیں، یہ کیوں؟ اس لئے کہ غربت و امارت امتحان کا صرف ایک ذریعہ ہے، یعنی جو غریب ہے اس کے صبر کا اور جو امیر ہے اس کے شکر کا بیک وقت امتحان ہو رہا ہے قارون کو گنج بے پایاں دیا گیا مگر اس نے احسان فراموشی کی اور اس لئے شداد کی طرح وہ بھی سزایاب ہوا۔ خاتم النبیین نے اپنی غربت و فاقہ کشی پر "الفقر فخری" کا اعلان کیا اور اس لئے انعام میں "خیر البشر" کا تمغہ پایا۔ "گندم از گندم بروید جو ز جو"۔ شیطان کی رشوت قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ ہر شخص خود کرتا ہے "لا اکراہ فی الدین" پس فراعنہ نے رشوت قبول کر لی، مگر جناب عیسیٰ نے خدا کی راہ میں خود طمانچے کھا کر شیطان کو طمانچے لگائے ہیں۔

اگر خدا، جناب عیسیٰ کو طمانچے کھانے کے لئے، حضرت خیر البشر کو کانٹوں پر چلنے کے لئے اور جناب سید الشہداء کو ریگ تفتہ پر ذبح ہونے کے لئے چھوڑ نہ دیتا تو اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! آج دنیا کو کس طرح پتہ چلتا ہے کہ فدائیوں کی شان کیا ہے اور شیطان کی رشوت کس کس نے قبول نہیں کی۔ اور ہمارا اللہ اپنے ہر فدائی کو حضرت ابراہیم کی طرح آتشِ نمرود سے، حضرت موسیٰ کی طرح تعاقب فرعون سے، اور حضرت عیسیٰ کی طرح صلیب جہود سے، اگر بچا لیتا تو شیطان اس وقت یقینی چیخ اٹھتا کہ واہ واہ تلوار کی جھنکار اور چیز ہے، تلوار کا گلے پر چلنا اور چیز ہے، ہر شخص جب حضرت اسماعیل کی طرح چھری سے بچا لیا گیا تو فرزندان آدم کے امتحان کی تکمیل کب اور کس پر ہو گی؟ پس فدائیان ماسبق کے امتحانات کی تکمیل جب ساحلِ فرات و دربار یزید و قید خانۂ دمشق میں ہو رہی تھی اس وقت تکمیل میں نقص رہ جاتا، اگر فوج الٰہی و فوج ابلیس کی باہمی زور آزمائیوں میں تائید الٰہی آکر ذرا بھی دخل دیدیتی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تسلیم و رضا، نیاز و عبدیت، دعوئے "الفقر فخری"، و طلاق دنیا یکقلم ناممکن العمل ہو جاتے۔ دار الامتحان میں پھر جو بھی آتا وہ یہی کہتا کہ علاؤ الدین کا چراغ ہم کو بھی مل جاتا تو ہم بھی رات بھر میں موتی محل طیار کر دیتے مسلمانوں کے خدا نے بے شک اپنے ایک فدائی کو آتشِ نمرود سے بچا لیا اور دوسرے فدائی کو شمشیرِ شمر کا شکار ہونے دیا تاکہ فرزندانِ آدم باغ ابراہیم کی سند پا کر وعدۂ باغِ جنت کو مشکوک نہ سمجھیں۔ اور سرفروشئ حسین کی سند پا کر تسلیم و رضا کو ناممکن العمل نہ سمجھیں، مگر یاد رہے کہ ان زبردست اسناد و نظائر کے ہوتے ہوئے جب یزید نے شیطان کی رشوت قبول کر لی اور اصحاب فیل کا انجام ہونے کے بعد بھی جب ابو طاہر نے بیت اللہ کو تاراج کیا تو اللہ نے بھی یزید و ابو طاہر کی جرأت و ہمت دیکھ کر دونوں کی رسی دراز کر دی۔ ورنہ نمرود والا مچھر اور اصحاب فیل والی ابابیلیں، ہمارے اللہ کے پاس ہر وقت موجود ہیں، خود ابلیس کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ بزم قدس سے نکالے جانے کے بعد وہ جہنم کی چہار دیواری میں بالکل محبوس نہیں کر دیا گیا بلکہ اس کی رسّی اتنی دراز کر دی گئی کہ بھیس بدل کر جنت آدم میں وہ باریاب بھی ہوا، شجر ممنوعہ کا راز بھی فاش کر سکا اور اس دار الامتحان میں آدم و حوّا کی تشریف آوری کے وقت سے اس کو اس کی بھی اجازت ہے کہ جب تک امتحان ہوتا رہے وہ نسلِ آدم کو رشوت دے کر یہ بھی مشاہدہ کرتا رہے کہ "کون کتنے پانی میں ہے"؟ ——— زلیخا کے دستِ ہوس اور پائے ناز چشم فسوں ساز و جبینِ نیاز، سنِ شباب و کمند التجا کی متحدہ زور آزمائیاں ایک طرف اور ایک پردیسی غلام کی "نہیں، نہیں" دوسری طرف ؎

کیونکر اس کی نگہ ناز سے جینا ہوگا، زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

کال کی کوٹھری سے کور انکل آنا اور قعرِ دریا میں تختہ بند ہونے کے بعد بھی دامن تر نہ کرنا۔ واقعہ یہ ہے کہ اہ کنعاں کی روحانی معراج تھی! اور اسی مشاہدے نے آشکارا کر دیا کہ مٹی اشرف المخلوقات کیوں گردانی گئی اور ملائکہ اس کے آگے سجدہ کرنے پر کیوں مجبور کئے گئے۔

کون کتنے پانی میں ہے ؟ — سپہ[1] سالار علی بیگ خاں لکھنوی، عباس ایرانی سے کہتا ہے کہ اس مرتبہ عشرۂ محرم میں ہم کو ایک یزید کی ضرورت ہے، تم کو قبول ہو تو دو ہزار کی تھیلی حاضر ہے، عباس ایرانی لکھنؤ کا ایک معمولی دوکاندار۔ دو ہزار کا نام سن کر فوراً راضی ہو جاتا ہے، عشرۂ محرم شروع ہوتا ہے۔ لکھنؤ کا عشرہ اور وہ بھی شجاع الدولہ کے زمانہ کا! لاکھوں کا مجمع ہے جس میں عباس ایرانی کے بیسیوں بھائی بند اور روز کے ملنے والے بھی موجود ہیں، اتنے میں عباس ایرانی یزید کے بھیس میں آتا ہے اور سامان تو پہلے ہی سے موجود ہیں، عباس کے آتے ہی دربار دمشق کی سماں بندی شروع ہو جاتی ہے :- دیکھو دیکھو وہ ناقے آرہے ہیں، ناقوں پر فاقہ کش بیبیاں ہیں، سر ننگے ہیں، چادریں چھن چکی ہیں، ساحلِ فرات سے پیاسی آرہی ہیں، تلواروں کے سایہ میں ہیں، ناقہ کی مہار ایک بیمار کے ہاتھ میں ہے، بیمار پا پیادہ ہے، پا پیادہ ہے مگر پا بہ زنجیر ہے، زنجیریں بھاری ہیں۔ جھنکار زنجیروں کی سنائی نہیں دیتی، قہقہوں کی آواز سب پر بالا ہے، آج یوم العید ہے، تماشائی گویا سیلِ دریا ہیں، بلند نیزوں پر شہیدوں کے سر ہیں، ایک نیزہ پر شبابِ جنت (کے سردار) کا سر ہے، یہ سر تحفۃً دربار میں پیش ہوتا ہے، کس طرح پیش ہوتا ہے؟ ایک طشت میں۔ کہاں رکھا جاتا ہے؟ تاجدار دمشق کے پیروں کے پاس۔ تاجدار کیا کرتا ہے؟ بید کی چھڑی سے ٹھکراتا ہے؟ کس چیز کو ٹھکراتا ہے؟ لب ہائے شہید کو۔ کیوں ٹھکراتا ہے؟ تاکہ قبر مدینہ کی دیواریں ہٹ جائیں، کیوں ہٹ جائیں؟ اس لئے کہ صاحبِ قبر مطہر انھیں لبوں کے بوسے لیا کرتے تھے! .....

اس سماں بندی کے بعد اب ایرانیوں کو تاب کہاں؟ ہر گوشے سے "بکُش بکُش، بزَن بزَن" کے نعرے بلند ہوتے ہیں، بے خودی میں سیکڑوں تلواریں بے نیام ہوتی ہیں، بجلی کی طرح یزید کے سر پر چمکتی ہیں، مصنوعی یزید خود اپنے بھائی بندوں کو شمشیر بکف دیکھ کر چلاتا ہے :- "ہاں ہاں میں یزید نہیں، تم لوگ پاگل ہو، میں عباس ہوں عباس، شہید کربلا کا ماتم دار ہوں، دشمن نہیں، ٹھہرو، ٹھہرو، میں عباس ہوں اچھی طرح پہچان لو، یزید نہیں ہوں، عباس، عباس، عباس....." مگر سیکڑوں تلواریں اس عباسی یزید کو چشم زدن میں قیمہ کر ڈالتی ہیں۔ اللہ رے یزید کی نحوست! جس کسی نے ایک گھنٹہ کے لئے بھی تفریحاً یزید بننا چاہا اس کو مزہ مل گیا کہ اس نام کی برکت کیا ہے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ — دمشق کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لئے نمازی آچکے ہیں۔ خلیفہ ولید ثانی[2] کی خدمت میں آدمی پر آدمی جاتے ہیں کہ یا امیر المومنین! اب صرف آپ ہی کا انتظار ہے، امیر المومنین جواب دیتے ہیں کہ چلو ہم فوراً آئے، خدا خدا کر کے امیر المومنین مسجد میں تشریف لاتے ہیں، ہزاروں نمازی صف بہ صف ایستادہ ہیں، امیر المومنین امامت شروع کرتے ہیں، امامت ختم ہوتی ہے، اب نمازی مصافحہ کے لئے آگے بڑھتے ہیں، امیر المومنین کو کسی کی دل شکنی منظور نہیں، امیر المومنین بھی اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھاتے ہیں — ایں! یہ ہاتھ تو واقعی چومنے کے قابل ہیں، پنجۂ مرجان، مخملی ہتھیلیاں، پتلی انگلیاں، نازک کلائیاں صاف بتا رہی ہیں کہ ہاتھ کسی دلیخا یا عیش بائی کے ہاتھ ہیں۔ "حضرت امیر المومنین خود نیامدہ اند، اما برائے عزت افزائی بیت اللہ و تفریح نازگزاراں، معشوقۂ خود را فرستادہ اند"۔ نمازی اب سر پیٹ رہے ہیں۔ مگر سر پیٹنے سے کیا ہوتا ہے، امیر المومنین کی معشوقہ، امیر المومنین کے حکم سے، امیر المومنین کے بھیس میں آئی بھی اور نماز جمعہ پڑھا کر اب واپس بھی جا رہی ہے!

کون کتنے پانی میں ہے؟ — مہاراجہ شتاب[3] رائے عظیم آباد کا نائب ناظم، ایک مرتبہ جنرل اسمتھ سے ملنے کے لئے باڈھ جاتا ہے، باڈھ میں ایک مندر کے پشت پر خیمہ زن ہوتا ہے، مندر کے چالاک برہمن آکر خدمت میں کب حاضر ہوتے ہیں جب شتاب رائے جنرل اسمتھ سے ملنے کے لئے پالکی میں بیٹھ رہا ہے، شگون کا وقت ہے۔ برہمن دست بستہ عرض کرتے ہیں — "مہاراج! آنند، آنند! جہاں پر تم کھڑے ہو وہ جگہ مہا پتر ہے، خود مہادیو جی کے چرن اس کو چھو چکے ہیں، آج پورنیما ہے، پجاریوں پر بھی مہاراج کی دیا ہو"۔ شتاب رائے جواب دیتا ہے — "یہ باتیں تم اس سے کرنا جو یہاں تیرتھ کو آیا ہو، یا مندر میں درشن کا بھوکا ہو، ہم کو تم سے یا تمہارے مندر سے کیا کام"۔ یہ کہکر

---

[1] سیر المتاخرین جلد چہارم صفحہ ۲۸ حاشیہ — [2] ہسٹری آف سرسین مصنفہ جسٹس امیر علی صفحہ ۱۹۶ — [3] سیر المتاخرین جلد سوم صفحہ ۶۴ - ۶۱

پالکی میں بیٹھ جاتا ہے اور کسی کو ایک کوڑی نہیں دیتا۔

مہاراجہ شتاب رائے جب کوئی نیا محل تعمیر کرتا ہے تو بھائی بند، دوست احباب تقاضہ کرتے ہیں کہ برہمنوں کو بھوج دے کر محل کی نیو اور اپنا دھرم مضبوط کرلو۔ شتاب رائے جواب دیتا ہے کہ گرجاں طلبی مضایقہ نیست، مگر اپنے مکان کو ہم نجس نہیں کرسکتے، برہمنوں کو بھوج دینا ایسا ہی فرض ہے تو گنگا کا کنارہ موجود ہے، روپے ہم سے لے لو، مہاراجہ شتاب رائے کا سخن تکیہ اُٹھتے بیٹھتے "واللہ باللہ" ہے، ہر سال مشکل کشا کا دسترخوان چنتا ہے، ماہ صیام میں شب ضربت آتی ہے تو کھیر اور مٹھائیوں پر فاتحہ دے کر تمام شہر میں تقسیم کرتا ہے اور اپنے دونوں لڑکوں کا ختنہ کراتا ہے، اس کھلم کھلا بغاوت پر خاندان بھر میں کہرام مچتا ہے، "تالیفِ قلب کے نسخے تجویز ہو رہے ہیں، مرلی دھر، رائے قتل داس اور سردر سنگھ احباب خاص اصرار کرتے ہیں کہ شہر میں ایک برہمن آیا ہوا ہے، رشی ہے، مہاتما ہے، درشن کے قابل ہے، تم بھی چلو، شتاب رائے مجبوراً ساتھ ہولیتا ہے، گرگ باراں دیدہ برہمن مہاراجہ شتاب رائے کو دیکھ کر اپنا داریوں شروع کرتا ہے۔ "مہاراج، ہم نے تمھارا جنم پترا دیکھ کر ایک بچار کیا ہے، نام بہت سندر ہے، رات دن تم اسی نام کا مالا جپا کرو"۔ شتاب رائے شیشہ کا جواب پتھر سے دیتا ہے، "جوگی مہاراج! اللہ کے ایک ہزار ایک نام ہیں، انھیں ناموں میں سے ایک نام اپنے لئے ہم پہلے ہی بچار چکے ہیں"۔ برہمن گھبرا کر پوچھتا ہے کہ آخر وہ کونسا نام ہے؟ شتاب رائے کہتا ہے کہ وہ نام بتانے کا نہیں، برہمن کہتا ہے کہ جب بتانے کا نہیں تو جپنے کا بھی نہیں ہے۔ شتاب رائے کہتا ہے اچھا سنو، وہ نام "رحیم" ہے نبض شناس برہمن قہقہہ مار کر کہتا ہے۔ "مہاراج! رام اور رحیم تو ایک ہی پرماتما کے دو نام ہیں۔ شتاب رائے ہیرے کو ہیرے سے کاٹتا ہے۔ "گرو جی مہاراج! اب آگے نہ بڑھنا، رام کو رحیم سے کیا نسبت؟ رام کا نام سنتے ہی دسترتھ یاد آجاتا ہے، رام بیٹا اور دسترتھ باپ، مگر اللہ کے نام میں جھالر پھندنا کچھ بھی نہیں، اس نام میں کسی رشتہ ناتے کی بو تک نہیں"۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ — پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم پڑھ کر برہمن لوگ مارے غصہ کے بھوت ہو رہے ہیں۔ پنڈت سے پوچھتے ہیں۔ "ایں! خیر تو ہے! تیرے منھ سے حمد، نعت اور منقبت کیسی؟ اللہ، رسولؐ، پنجتنؑ کے رشتے جوڑنے کے کیا معنی؟" پنڈت دیا شنکر آخر شاعر ہے، فی البدیہہ کہتا ہے:- "مہاراج! اس میں چیں بہ جبیں ہونے کی کیا بات ہے؟ میری مثنوی کا مطلع پڑھئے ؎

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمد باری

یعنی اپنے "ہر" کا نام ہم نے پہلے لے لیا تھا، تب حمد باری شروع کی۔" برہمنوں کے ماتھے پر اب ایک شکن نہیں، سب خوش خوش گھر واپس جا رہے ہیں، مگر پنڈت دیا شنکر قلم ہاتھ میں لے کر اس کو یوں مخاطب کرتا ہے:- "اے سنتا ہے؟ یہ رسائی فکر اور گلو خلاصی ثمرہ ہے حمد باری کا اللہ کی حمد نہ کئے ہوتے تو اس وقت یقینی شہ مات تھی!"

کون کتنے پانی میں ہے؟ — بکسر کی لڑائی کو دس برس ہو چکے ہیں شجاع الدولہ تخت اودھ کی بہاریں دیکھ رہا ہے، یکایک قریب ناف ایک پھوڑا نمودار ہوتا ہے، پھوڑا کیا ہے ایک چھوٹا تربوزہ ہے، پھوڑا پھوٹتا ہے، اطبا کہتے ہیں کہ یہ لاعلاج ہے، آخر یہ پھوڑا ہوا کیونکر؟ چشم دید گواہ کہتے ہیں کہ حافظ رحمت خاں سپہ سالار روہیلکھنڈ جب مارا گیا تو شجاع الدولہ نے اس کی بیوی بچوں کو حرم سرا میں نظر بند کیا، مرحوم کی ایک لڑکی تھی، دوشیزہ، سترہ کا سن، کشیدہ قامت، صاحب جمال، باعصمت! شجاع الدولہ نے ہم آغوشی چاہی، ناجائز و جبریہ ہم آغوشی، لڑکی جب خلوت میں طلب ہونے لگی تو ماں نے بلا کر کہا۔ "بیٹی! یاد رکھنا کہ تیری رگوں میں سپہ سالار حافظ رحمت خاں کا خون ہے! تو اس لئے پیدا نہیں ہوئی تھی کہ کسی کی داشتہ بن کر رہے، بالخصوص اس کی داشتہ جو تیرے باپ کا قاتل ہے"۔ دوشیزہ نے اپنی زلفوں میں ایک زہر آلود چاقو چھپا لیا۔ اور خلوت میں حاضر ہوئی۔ شجاع الدولہ نے بستر عیش پر شجر ممنوعہ سے پھل توڑا، مگر اسی عالم میں دوشیزہ کے زہر آلود چاقو نے عیش پسند کو عدم کا سبق پڑھایا، عیش پسند نے اسی کرب و اضطراب میں خواجہ سراؤں کو اشارہ کیا، تین خواجہ سراؤں نے دوشیزہ کو خنجر سے فوراً ٹھنڈا کر دیا آئندہ کے خدشوں

لہ سیر المتاخرین جلد چہارم صفحہ ۶۲ — ۶۰ نیز حاشیہ صفحہ ۶۸ - ۶۷

سے بچنے کے لئے دو ہزار بیگمیں شاہی محل سے شہر بدر کی گئیں ان دو ہزار میں چار سو ایسی تھیں جنھیں سات برس کی مدت میں یعنی دو ہزار پانچسو پچپن راتوں میں صرف دو بار شجاع الدولہ کی ہم بستری نصیب ہوئی تھی۔ الغرض چشم دید گواہ کہتے ہیں کہ یہ پھوڑا اسی زہر آلود چاقو کی یادگار ہے مگر اور لوگ کہتے ہیں کہ نہیں، آج سے ایک برس پہلے ایسا ہی زخم پشت یا شانہ پر نمودار ہوا تھا۔ شجاع الدولہ نے پانچ لاکھ روپے کی نذر مانی تھی اور جب صحت یاب ہوا تھا تو نذر اُتار بھی دی گئی ۔ شجاع الدولہ پر کیا ہے اس کے باپ اور نانا کو بھی یہی عارضہ تھا اور اسی میں دونوں فوت بھی ہوئے، پس یہ پھوڑا کسی زہر آلود چاقو کا اثر نہیں ہے بلکہ باپ اور نانا سے ترکے میں ملا ہے۔ کوچۂ دبازار میں اس طرف یہی روایتیں مشہور ہو رہی ہیں اور اس طرف شاہی محل میں اندھیرا ہو رہا ہے پھوڑا اپنے شباب پر ہے۔ اس شباب کو زوال نہیں، شجاع الدولہ پریشان ہو کر فیض آباد جاتا ہے، وہاں کی آب و ہوا بے فیض ثابت ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہی پھوڑا ہے اور وہی جاں کندنی ہے، ۲۲ ذیقعدہ روز پنجشنبہ ۱۱۸۸ھ اس جاں کندنی سے نجات ہوتی ہے۔

کون کتنے پانی میں ہے ؟ — شجاع الدولہ کو غسل میت[1] دیا جا رہا ہے، غسل و کفن ہو چکا، اب جنازہ محل کے باہر آ گیا ہے، جنازہ کہاں جا رہا ہے ؟ گلاب باغ جا رہا ہے، یہ باغ کہاں ہے ؟ چار میل کے فاصلہ پر، جنازہ کے ساتھ ساتھ کون کون ہیں ؟ مرزا علی خاں، اور سالار جنگ ہیں، وزرائے سلطنت اور مشاہیر فوج ہیں، شاہی خاندان اور متوسلین خاندان ہیں، غرضیکہ فیض آباد کی ٹھیکری ٹھیکری ہے ہاتھی گھوڑوں کی قطار پیچھے ہے، کیا یہ سب لوگ چار میل تک پیدل ہی جائیں گے ؟ دو میل کی مسافت طے ہو چکی، مگر دیکھ لو شانہ بدلنے کے لئے لوگ اب بھی ٹوٹے پڑ رہے ہیں، — ایں، یہ ماتم داروں کی صف چیرتے ہوئے کون بدتمیز چلے آ رہے ہیں ؟ یہ بدتمیز قاصد ہیں مرزا امانی کے۔ مرزا امانی کون ؟ مرزا امانی عرف آصف الدولہ۔ جس کا جنازہ جا رہا ہے، اسی کا سپوت بیٹا۔ کیا آصف الدولہ اپنے باپ کے جنازہ کے ساتھ نہیں ہے ؟۔ ساتھ ہوتا تو ہرکارے کیوں بھیجتا، آخر ساتھ کیوں نہیں ہے ؟ اپنی سعادت مندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ ہرکارے کیوں بھیجے ہیں ؟ مرزا علی خاں اور سالار جنگ کو پیام آیا ہے کہ جنازہ چھوڑ کر میرے پاس فوراً چلے آئیں، یہ دونوں آصف الدولہ کے کون ہیں ؟ سگے ماموں ہیں! ماموں ہرکاروں سے کیا کہہ رہے ہیں ؟ کہہ رہے ہیں کہ جنازہ جب تک گلاب باغ نہ پہونچ لے ہم کیونکر چھوڑیں، اور چھوڑیں بھی تو خلق اللہ کیا کہے گی — ایں! اب یہ دوسرے ہرکارے صفِ ماتم کو چیرتے ہوئے کیوں آئے ہیں ؟ یہ حکم لے کر آئے ہیں کہ دونوں ماموں اگر یوں نہ آئیں تو پکڑ کر لاؤ۔ تب ؟ دونوں ماموں مجبوراً جنازہ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں اور خلق اللہ انگشت بدنداں ہے۔ ماموں بھانجے میں کیا گفتگو ہو رہی ہے ؟ بھانجہ اپنے دونوں ماموں سے کہہ رہا ہے کہ باپ کا غم ہوتا رہے گا، پہلے آپ لوگ ہم کو جانشین قرار دے لیجئے۔ پھر ؟ — پھر یہی کہ دونوں ماموں کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں کہ اتنی عجلت کیوں ہے ؟ مگر بھانجہ کہتا ہے کہ واہ ! نمازِ میت کے بعد ہی گلاب باغ میں اگر میرا چھوٹا بھائی مرزا سعادت علی جانشین قرار دیدیا گیا تو پھر ہم کیا کر لیں گے ؟ تب ؟ تب یہی کہ مرزا علی خاں سالار جنگ اور کرنل کلیس مجبوراً آصف الدولہ کے سر پر شاہی عمامہ باندھ رہے ہیں، فوجی باجہ تخت نشینی کا اعلان کر رہا ہے، جنازے کے ساتھ جتنے مشاہیر تھے سب دربار میں بلائے گئے ہیں۔ صرف غربا و مساکین نمازِ میت کے لئے چھوڑ دئے گئے ہیں، اس طرف سپوت بیٹا مشاہیر سلطنت کی نذریں لے رہا ہے اور اس طرف باپ کی لاش پیوند خاک ہو رہی ہے، مرزا امانی عرف آصف الدولہ تخت اودھ پر بیٹھ کر کیا کرتا ہے ؟ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے پالکی بردار کہار کو "راجہ مہرا" کا خطاب دیکر امورِ سلطنت میں شریک کرتا ہے!

کون کتنے پانی میں ہے ؟ — جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی طرف سے میر مدن دھاوا کر رہا ہے اتنے میں ایک توپ کا گولہ آتا ہے اور میر مدن کی جان غائب۔ میر مدن کا انجام دیکھ کر سراج الدولہ اپنی ٹوپی میر جعفر خاں سپہ سالار کے پاؤں پر رکھتا ہے کہ اب میری جان اور آبرو تمہارے ہاتھ میں ہے، میر جعفر خاں کہتا ہے کہ اب اس وقت تو شام ہوئی کل صبح دیکھا جائے گا۔ اب یہی گفتگو ہو رہی ہے کہ اتنے میں موہن لال،

---

[1] سیر المتاخرین جلد چہارم صفحہ ۷۱ - ۷۸

سراج الدولہ کی طرف سے آگے بڑھ گیا، اس کو بڑھتا دیکھ کر میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ "موہن لال بھاگ آؤ" سراج الدولہ میر جعفر کا منھ تکتا ہے میر جعفر خاں جواب دیتا ہے کہ "حضور میری تو یہی رائے ہے" موہن لال کو بھاگتا دیکھ کر فوج کے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں۔ سراج الدولہ اب میدان میں بے یار و غمگسار اکیلا کھڑا ہے، مجبوراً میدان چھوڑتا ہے، رات بھر چلتا ہے، آٹھ بجے صبح منصور گنج محل میں پہونچتا ہے۔ افسران فوج کو حکم دیتا ہے کہ کم سے کم میری ذاتی حفاظت کے لئے محل میں پہرہ کا سامان کردو۔ ایک سپاہی نہیں آتا، اس عالم میں تین بجے رات کو محل سے پوشیدہ فرار ہوتا ہے بھگوان گولہ سے ہوتا ہوا ناؤ پر راج محل کے دوسرے ساحل پر پہونچتا ہے صرف ایک گھنٹہ کے لئے اُترتا ہے کہ کھچڑی[1] پکا کر تین دن کا فاقہ توڑے، تین برس کی بچی جو ساتھ ہے وہ بھی فاقہ سے ہے، سراج الدولہ چولھا سلگانے بیٹھتا ہے قریب میں شاہ دانا کا جھونپڑا ہے۔ شاہ دانا فاقہ کشوں کے پاس آتا ہے، دیکھ کر سر پیٹتا ہے، کہتا ہے کہ حضور فقیروں کا نان و نمک قبول ہو، نان و نمک حاضر کرنے کے لئے شاہ دانا اپنے جھونپڑے میں واپس جاتا ہے، وہاں پہونچکر میر قاسم اور میر داؤد کو خفیہ خبر بھیجتا ہے — "جلد آؤ! تمہارا شکار اس وقت میرے دام میں ہے"۔ شکاری پہونچتے ہیں — سراج الدولہ صید ہو کر مرشد آباد آتا ہے۔ دوپہر کا وقت ہے، میر جعفر خاں اب شاہ بنگالہ ہے، بھنگ کے نشہ میں بے ہوش پڑا ہے اس کا بیٹا میرن حکم دیتا ہے کہ سراج الدولہ کو بغل کے کمرے میں بند کردو۔ پھر میرن اپنے مصاحبین خاص میں سے محمدی بیگ کو قیدی کے کمرے میں بھیجتا ہے جلاد کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر سراج الدولہ عرض کرتا ہے کہ وضو کے لئے تھوڑا سا پانی دیدو "نماز توبہ" پڑھ لیں، محمدی بیگ توبہ کا دشمن ہے اس لئے پانی دینے سے انکار کرتا ہے، سراج الدولہ چلاتا ہے "پانی پانی، ایک گھونٹ پانی، خدا کی راہ میں"۔ شمر اس کی پیاس بجھاتا ہے مگر صرف آب شمشیر سے، سراج الدولہ اسی جاں کندنی میں در و دیوار سے کہتا ہے — "بس! ہم چلے! الفراق، اے دُنیا الفراق! آج حسین قلی خاں کا خون بیباق" جلاد اپنی شمشیر خوں آشام سے لاش کو پارچہ پارچہ کرتا ہے، میرن اس نعشِ صد پارہ کو ہاتھی پر رکھوا کر مرشد آباد کے بازاروں میں گشت کے لئے بھیجتا ہے، فیل بان اپنی کسی ضرورت سے ہاتھی کو اتفاقیہ بازار میں ٹھہراتا ہے، مگر ہاتھی جس دروازے کے سامنے اس وقت رُکتا ہے وہ خدا کی شان کہ حسین قلی خاں کا دروازہ ہے، ہاتھی رُکتا ہے اور نعش صد پارہ سے خون کے چند قطرے ٹھیک اسی جگہ پر گرتے ہیں جہاں آج سے دو برس پہلے شام کے وقت سراج الدولہ نے حسین قلی خاں کا خون بہایا تھا، بیشک حسین قلی خاں کا خون آج بیباق ہو گیا، ہاتھی اب آگے بڑھتا ہے، اس محل سے گزرتا ہے جہاں سراج الدولہ کی ماں آمنہ بیگم ہے، کسی نے آمنہ بیگم سے کہدیا کہ:۔ "بی بی! تم کو بسنت کی کچھ خبر بھی ہے؟ جوان بیٹے کی لاش گشت کے لئے جارہی ہے"۔ آمنہ بیگم چیخ مارتی ہوئی ننگے پاؤں، ننگے سر، زنان خانہ سے بازار میں دوڑی آتی ہے بیٹے کی لاش پر گر کر بلائیں لیتی ہے، آمنہ بیگم کی فغاں و سینہ کوبی سے بازار میں زلزلہ آگیا، خلقِ خدا ماتم کر رہی ہے، شقی القلب خادم حسین اپنی چھت سے یہ تماشہ دیکھ رہا ہے، اپنے عصا برداروں کو دوڑاتا ہے۔ عصا بردار بازار میں آتے ہیں اور آمنہ بیگم کو تھپڑ، گھونسے اور لاٹھیوں سے مار کر بیٹے کی لاش سے چھڑاتے ہیں، اب ہاتھی آگے بڑھتا ہے، اِدھر نعشِ صد پارہ گشت ہو رہی ہے اور اِدھر میر جعفر خاں بھنگ کے نشہ سے ہوش میں آتا ہے، خبر ہوتی ہے کہ سراج الدولہ قید ہو کر آگیا، میرن کو رقعہ لکھتا ہے کہ:۔ "بیٹا قیدی بھاگنے نہ پائے، خبردار"۔ میرن حاملِ رقعہ سے کہتا ہے کہ:۔ "ابا جان سے کہدیجیو کہ آپ کا بیٹا آپ سے زیادہ تیز ہے"۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ — سراج الدولہ کے بعد اس کے چھوٹے بھائی مرزا مہدی[2] کی باری آتی ہے، پندرہ برس کا لڑکا نہایت حسین دو تختوں میں داب کر مار ڈالا جاتا ہے۔ اس کے بعد آمنہ بیگم اپنی بڑی بہن گھسیٹی بی بی کے ساتھ قید کر کے ڈھاکہ بھیجی جاتی ہیں جسارت خاں گورنر ڈھاکہ کو میرن خط بھیجتا ہے کہ ان دونوں کو وہیں دریا میں ڈبا دو۔ جسارت خاں جواب دیتا ہے کہ گورنری کو سات سلام، مگر یہ اندھیر ہم سے نہ ہوگا، تب میرن اس کو لکھتا ہے کہ اچھا حاملِ رقعہ کے ساتھ ان دونوں کو میرے پاس مرشد آباد بھیجدو، جسارت خاں دونوں کو حاملِ رقعہ کے ساتھ کر دیتا ہے، میرن کا قاصد دونوں کے ساتھ ناؤ پر سوار ہوتا ہے، جب ناؤ ایک سنسان مقام پر پہونچتی ہے تو قاصد کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں

---

[1] سیر المتاخرین — [2] سیر المتاخرین جلد دوئم صفحہ ۲۵۱ — [3] ایضاً ایضاً صفحہ ۳۰۱ - ۳۲۹

کیونکہ اب اس کو میرن کے پوشیدہ حکم کو بجالانا ہے، کہتا ہے کہ :۔ "بی بیو! آج تمام دن تم لوگوں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ فاقہ شکنی کرلو اور اُجلے کپڑے بدل لو، کیونکہ یہ آخری سفر ہے" آخری سفر کا نام سن کر گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم تھرّا جاتی ہیں، پھر چھوٹی بہن سنبھل کر بڑی بہن سے کہتی ہے کہ :۔ سنو جی! موت سے ڈرنا کیسا، جو آتا ہے مرنے کے لئے آتا ہے، عید مناؤ کہ اس خونِ ناحق سے ہم دونوں کے گناہوں کی گٹھری خود بخود میرن کے سر پر چلی جائے گی، موت کی موت، کفّارہ کا کفّارہ اور انتقام کا انتقام، ایسی موت تو قسمتوں سے ملتی ہے" یہ کہکر دونوں بہنیں وضو کرتی ہیں، کفن کی جگہ اُجلے کپڑے پہنتی ہیں، خاک شفا ملتی ہیں، دعائے توبہ پڑھتی ہیں، پھر میرن کے قاصد سے کہتی ہیں کہ :۔ "ہم دونوں اب طیار ہیں، بھیّا! تم اپنا کام کرلو" قاصد ہچکچاتا ہے، یہ کہکر دونوں بہنیں ہاتھ پھیلا کر بہ آواز بلند توبہ مانگتی ہے کہ :۔ "خدایا! اپنے گنہگار کنیزوں کی آواز سن، جس رکابی میں میرن آج کھا رہا ہے، وہ رکابی تیرے کنیزوں کی ہے، کنیزیں گنہگار ہیں تو تیری محسن کُش میرن کی سرکوبی کے لئے اپنے قہر کی بجلی بھیج اور اپنی کنیزوں کا انتقام لے" اس مناجات و فریاد کے بعد دونوں بہنیں قبلہ رو ہوتی ہیں، کلمہ پڑھتی ہیں، خاکِ شفا کو بوسہ دیتی ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بیک وقت دریا میں کود پڑتی ہیں۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ —— جس شب کو دریائی موجوں نے گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم کو اپنے آغوش میں لیا۔ اسی شب کو تقریباً تین سو کوس کے فاصلہ پر میرن اپنے مصاحبین خاص کے ساتھ دریا کے کنارے خیمہ زن ہے، شروع برسات ہے، بادل کی گرج اور موسلا دھار پانی سے عاجز ہوکر گیارہ بجے رات کو اپنے بڑے خیمہ میں سے ایک مختصر دلیر خانی خیمہ میں پناہ کے لئے آتا ہے، اس چھوٹے خیمہ میں آکر میرن ابھی پلنگ پر لیٹ ہی رہا تھا کہ اتنے میں بجلی خیمہ کو چیرتی ہوئی آتی ہے اور اس کے سر پر گرتی ہے، اب دیکھا جاتا ہے تو پلنگ کے سرہانے پٹی جل کر راکھ ہوگئی ہے مگر خود میرن کا جسم راکھ نہیں ہے، بلکہ سر میں چھ سوراخ اور پیٹھ پر چھ سات کوڑوں کے نشان ہیں، اخفائے موت کے لئے یہ لاش صبح کو ہاتھی پر گشت کرائی جاتی ہے، وہ اس طور پر کہ دونوں پاؤں ہودج سے باہر لٹک رہے ہیں تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ میرن بیمار ہے اور سو رہا ہے مگر دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بیمار نہیں مردہ ہے۔ اور یہ مردہ اسی کا ہے جس نے آج سے تین برس پہلے سراج الدولہ کی نعش صد پارہ ہاتھی پر گشت کرائی تھی، کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟ —— میرن کا باپ میر جعفر شاہ بنگالہ، ۷۴ ۔ ۷۵ برس کا بڈھا، بستر علالت پر پڑا ہے، جسم مبروص ہے، شعبان کی چودھویں، سہ شنبہ کا دن ۱۱۷۸ھ ہے، آثار موت نمایاں ہیں، مہاراجہ نند کمار عیادت کو آیا ہے، معلوم ہوا کہ نواح مرشد آباد میں، کرت کونا مندر ہے —— اس مندر میں دیوتاؤں پر جو جل چڑھایا جاتا ہے، آبِ حیات ہے۔ میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ دیوتاؤں کا اُگشُ فوراً حاضر کیا

۱؎ سیر المتاخرین جلد دوئم صفحہ ۳۷۳، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۵۔

۲؎ مرشد آباد نگر سے کرت کونا مندر صرف ایک کوس ہے، مشہور ہے کہ دکھا نام ایک دیوتا نے اپنے یہاں دعوت میں سب دیوتاؤں کو مدعو کیا، مگر اپنی بیٹی ستی کو اور داماد شیو جی کو فہرست سے چھانٹ دیا، بیٹی ناخواندہ مہمان بن کر اپنے باپ کے گھر گئی بھی تو دیوتاؤں کی برادری نے اس کی طرف رُخ نہ کیا، اسی غم میں ستی نے خودکشی کرلی۔ شیو جی کو اس کی خبر ہوئی تو وہاں دوڑا گیا اور اپنی بیوی کی لاش کندھے پر رکھ کر ناچنا شروع کیا اس رقص سے اہلِ محفل کے ہوش اُڑ گئے، دنیا میں زلزلہ آگیا، مجبور ہوکر سب دیوتاؤں نے مل کر بشنو دیوتا سے فریاد کی کہ شیو جی اگر یونہی ناچتا رہا تو دنیا پاش پاش ہوجائے گی۔ یہ سن کر بشنو نے ستی کی لاش کو جو شیو جی کے کندھے پر تھی اپنے رتھ کے پہیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کرنا شروع کیا، ذرہ ہے گا بانس نہ بجے گی بانسری! لاش کے ۵۲ ٹکڑے ممالک ہند و آسام میں ۵۲ مقامات پر گرے، مثلاً کمروپ کمکھیا میں اندام نہانی گٹ کر گرا اور دیو گھر میں، جہاں بیج ناتھ کا مندر ہے دل کٹ کر گرا، اور بقیہ حصے کالی گھاٹ (کلکتہ) اور ڈرگا باڑی (بنارس) وغیرہ میں گرے۔ اس لاش کے سر پر جو تاج تھا، اس کا ٹکڑا اس مقام پر گرا جہاں اب کرت کونا مندر ہے، کرت بمعنی تاج، کونا بمعنی ٹکڑا ۔ کرت کونا، بمعنی تاج کا ٹکڑا۔

جائے، مندر سے آبِ حیات آتا ہے، دیوتاؤں کا پانی میر جعفر خاں کی آخری پیاس بجھاتا ہے، آخری پیاس اس لئے کہ یہ آبِ حیات حلق سے اُترتا ہے اور میر جعفر دریائے ممات میں غرق ہو جاتا ہے۔

اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! شیطان کی ریشہ دوانیوں کا اندازہ کرنا ہو تو ان اسناد و نظائر کو دیکھ لے، قیافہ شناس ابلیس صورت دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور پھر جس کو جیسا پاتا ہے ویسی ہی رشوت دیتا ہے۔ کسی سے کہتا ہے کہ تف ہے تمہاری صید افگنی پر کہ رحمت خاں کی پارسا لڑکی اب تک شکار نہیں ہوئی، کسی سے کہتا ہے کہ شاید تم نے مکڑیوں کا جال کبھی دیکھا نہیں کہ مکڑیاں گھر بیٹھے کس طرح بادشاہت کرتی ہیں، پس جنازہ کے ساتھ گلاب باغ جانے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ جنازے کے ساتھ جتنے لوگ ہیں انھیں کو اپنے پاس پکڑ وا بلاؤ۔ کسی سے کہتا ہے کہ خضر و سکندر کو شرمانا ہو تو کرت کونا مندر سے دیوتاؤں کا اُلٹا منگوا کر پی لو۔ کسی سے کہتا ہے کہ بہشت شداد کی تمنا ہو تو علی وردی خاں شاہ بنگالہ کی صاحبزادیوں اور نواسوں کے سینہ پر چڑھ کے بہشت کا دروازہ کھولا، کسی سے کہتا ہے کہ امیر المومنین کسی کا غلام نہیں ہے کہ نماز جمعہ پڑھانے کے لئے ہر آٹھویں دن مسجد دوڑا جائے، طلبی کے لئے اگر آدمی پر آدمی آ رہا ہے تو کیوں نہیں تم اپنی محبوبہ کو اس وقت امامت کے لئے بھیج دیتے ہو ؎

کہاں پھر جوانی، کہاں پھر یہ جوش　　غفور است ایزد تو ساغر بنوش

کسی سے کہتا ہے کہ عشرۂ محرم کا ڈرامہ موثر ہو نہیں سکتا جب تک یزید کا انتظام نہ کیا جائے، خبردار! یزید کی تلاش میں تم روپے کا منہ مت دیکھنا، دو ہزار میں بھی کوئی آدمی مل جائے تو غنیمت جاننا۔ کسی سے کہتا ہے کہ بھائی ایک گھنٹہ کے لئے یزید بنجانے میں آخر نقصان کیا ہے؟ ایمان میں خلل کیوں آنے لگا؟ کیا امام حسین تم سے گلہ کرنے آئیں گے؟ ارے دو ہزار کی رقم اس وقت مفت مل رہی ہے، اس کو لے لے۔ بعد میں عاقبت سنوار لینا۔

اللہ کے بندے جب شیطان کی رشوت قبول کر لینے کا تہیہ کرتے ہیں تو بالعموم ان کی رسی اور دراز کر دی جاتی ہے تاکہ اسی ذریعہ سے اور لوگوں کی آزمائش ہو سکے۔ چنانچہ یزید نے جب شیطنت اختیار کر لی تو یزید کے ساتھ دیگر بندگانِ خدا کا بھی امتحان ہو گیا یعنی ابلیس پرست شمر کی طرح ہزاروں لاکھوں نے یزید کا ساتھ دیا۔ لیکن خدا پرست حُر کی طرح چند آدمیوں نے امام الصابرین کا ساتھ دیا۔ فوج ابلیس کو وقتی عروج اور فوج الٰہی کو وقتی زوال یقینی ہوا، مگر اسی عروج و زوال میں ایک بہت بڑا امتحان پنہاں تھا

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالاں　　طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خرمی بینم

دہریئے اس طریقۂ امتحان سے ناواقف ہیں اس لئے فوج الٰہی کی وقتی شکست کو دیکھ کر فوراً خدا کی ہستی سے انکار کر دیتے ہیں اور انکار کی وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر خدا موجود تھا تو اپنے فدائیوں کی ذلت کیوں دیکھتا رہا، کلمہ گویوں کا جواب یہ ہے کہ جس خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طمانچے کھانے کے لئے چھوڑ دیا تھا اسی خدا نے امام الصابرین کو بھی ریگ تفتہ پر ذبح ہونے کے لئے معلقاً چھوڑ دیا تھا، تاکہ فوج الٰہی کی شکست دیکھ کر ابلیس کے جھنڈے کے نیچے کون کون جا کر پناہ لیتا ہے۔

"نگار" کے بعض سالنامے رعایتی قیمت پر

پاکستان یا جوبلی نمبر۔ فرمانروایانِ اسلام نمبر۔ علوم اسلامی نمبر مع ضمیمہ مستقبل کی تلاش نمبر ——— میزان

ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف دس روپئے میں مل سکتے ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

محروم کی شاعری
اور
اس کا وطنی و قومی پہلو۔

(گوپی چند نارنگ)

تلوک چند محروم کا نام زبان پر آتے ہی ذہن ایک قرن پہلے کے ان شاعروں کی طرف جاتا ہے جنھوں نے آزاد اور حالی سے نظم کی شمع ہاتھوں ہاتھ لے کر اردو شاعری کو اس کی روشنی سے معمور کر دیا۔ ان شاعروں میں اسمٰعیل میرٹھی، درگا سہائے سرور جہان آبادی اکبر الہ آبادی، شوق قدوائی، چکبست، اقبال، کیفی اور تلوک چند محروم کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان سب کی کوششوں نے نظم کو ایسی جلا دی کہ وہ غزل سے آنکھیں ملانے لگی۔ جو لوگ شاعری کو تہذیبی عوامل سے آزاد محض قرار دیتے ہیں انھیں محروم کے ہاں شاید کچھ نہ ملے کیونکہ محروم نے ہمیشہ شاعری کے سماجی اور اجتماعی منصب کو تسلیم کیا ہے اور یہی جذبہ ان کی نظم گوئی کا محرک ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاعری کی معراج حسنِ محض ہے، لیکن جب دل ناسور بنا ہوا ہو اور زمین انگارا سی دہکتی ہو تو چاند تاروں کی خنک روشنی کی باتیں راس ہی نہیں آتیں۔ ایسی حالتوں میں شاعری اپنا مقصد آپ نہیں رہتی بلکہ بہتر مستقبل کی تمنا کرنا بھی شاعر کا منصب بن جاتا ہے۔ محروم نے شاعری کے اسی نظریہ کو تسلیم کیا ہے۔ اور ساری عمر اسی روش پر گامزن رہے ہیں۔

بظاہر ان کی شاعری ہمہ رنگ ہے۔ انھوں نے پہاڑوں اور دریاؤں کے گیت گائے ہیں، ابھرتی ہوئی کرن کا استقبال اور ڈوبتے ہوئے ستاروں کا ماتم بھی کیا ہے۔ عشق کی وارداتوں اور فراق کی راتوں کے نغمے بھی سنائے ہیں۔ گائتری منتر، ویدوں کے اشلوک اور بھرتری ہری کے اقوال بھی دہرائے ہیں۔ رباعیاں اور قطعے بھی لکھے ہیں اور علم و دانش کے رموز و نکات بھی بیان کئے ہیں، لیکن دراصل یہ ان کا رنگ سخن نہیں۔ ان کی شاعری کو غور سے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اس کی تہ میں گہرا لیکن تھما ہوا کرب ہے۔ ایک بے نام سی بے چینی ہے اور بے پایاں شورش ہے۔ یہ شورش عبارت ہے انسانی قدروں کی پامالی سے۔ یہی محروم کا رنگ سخن ہے۔ انسان کو انسانی سطح پر استوار، ملک کو آزاد اور قوم کو خوش حال دیکھنے کی تمنا ان کی سب سے بڑی تمنا ہے اور یہی ان کی شاعری کی جان ہے۔

ان کی شاعری کے بارے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس کا آہنگ انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ یہ ذاتی مسرتوں یا غموں کا ترانہ نہیں بلکہ اس کا رخ پورے ملک اور قوم کی طرف ہے۔ اگر شاعر کے فرائض میں ملک اور قوم کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا بھی شامل ہے تو محروم کی شاعرانہ عظمت سے بھی انکار نہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کے رنگِ سخن سے سیر حاصل بحث تو ممکن نہیں، صرف اس کے قومی اور سیاسی پہلو کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

تلوک چند محروم ۱۸۸۶ء میں دریائے سندھ کے کنارے ایک چھوٹے سے گاؤں عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے، شاعری کا ملکہ فطرت سے ودیعت ہوا تھا۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ سامراجیوں کی لوٹ کھسوٹ اور وطن کی زبوں حالی سے متاثر ہو کر ایک نظم :-

"بھارت ماتا کیوں روتی ہے" کہی اس نظم سے ان کے ابتدائی رجحانات کا پتہ چلتا ہے :-

کب سے پامالِ جفا ہوتی چلی آتی ہے
ہدفِ تیرِ بلا ہوتی چلی آتی ہے،
کشتۂ تیغِ جفا ہوتی چلی آتی ہے،
یوں ہی مظلوم سدا ہوتی چلی آتی ہے
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا ؟

جس کی دولت سے ہوا ایک جہاں مالا مال
جس کے دریائے کرم سے کبھی دنیا تھی نہال
آج کل گردشِ افلاک سے ہو کر پامال،
سامنے غیر کے پھیلاتی ہے دامانِ سوال
تم کو معلوم ہے کیوں روتی ہے بھارت ماتا ؟

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں قومیت کا شعور واضح شکل اختیار کر رہا تھا۔ ہندوستانیوں میں تنظیم پیدا ہو چلی تھی اعلیٰ اور متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ ملک کی اقتصادی اور معاشی بدحالی کا راز سمجھنے لگے تھے۔ ملک کو صنعتی تباہی سے بچانے کے لئے کانگریس کا اولین قدم سودیشی کی تحریک تھا، محرومؔ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے:۔

وطن کی اُلفت میں ہر زباں پر سودیش و سنو، سودیش و سنو
سنا دو ہندوستان میں گھر گھر سودیش و سنو، سودیش و سنو
یہیں کی روئی، یہیں کی غزل، یہیں کا ریشم، یہیں کی مخمل
نہ لنکا شائر نہ مانچسٹر، سودیش و سنو، سودیش و سنو

لگ بھگ اسی زمانہ میں محرومؔ نے بہادر شاہ ظفرؔ کے اس مصرعے:۔ "اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں" کو تضمین کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا:۔

پرو بال اپنے اسیرو سنبھالو اُٹھو اور پھڑک کر قفس توڑ ڈالو
بگڑ جاؤ پاؤں سے رشتے نکالو بہم ہو کے بگڑی ہوئی کو بنالو
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ صیاد ظالم ہے، نامہرباں ہے محبت جو چاہو تو اس میں کہاں ہے
دل آزاریوں میں یہ اک آسماں ہے اذیت نئی، نت نیا امتحاں ہے
اسیرو کرو کچھ رہائی کی باتیں

یہ اور ان کی ایسی دوسری نظمیں ان کی صحیح اُٹھان کا پتہ دیتی ہیں۔

طالب علمی کے زمانہ ہی سے ان کا کلام مخزن اور زمانہ میں شایع ہونے لگا تھا، اردو کے ادبی افق پر اس زمانہ میں جو آوازیں سب سے بلند تھیں وہ اکبرؔ اور اقبالؔ کی تھیں۔ محرومؔ نے ان دونوں سے اثر تو لیا لیکن ان کے اور محرومؔ کے نظریوں میں ایک خلیج حایل تھی اکبرؔ مشرقیت کے گہرے پرستار تھے اور ماضی پرستی کی وجہ سے تاریخ کے دھارے کا رخ پہچاننے سے قاصر تھے وہ ہر جدید تحریک کی خواہ وہ قوم اور ملک کی ترقی کے لئے ہی کیوں نہ ہو، سخت مخالفت کرتے تھے۔ مدخولہ گورنمنٹ اگر وہ نیچی ہوتے تو بھی نئی تبدیلیوں کی طرف ان کا رویہ بدلنے والا نہ تھا۔ انگریز کی واضح سیاسی چالوں کو دیکھتے ہوئے بھی وہ مہاتما گاندھی اور تحریک آزادی کو لغو سمجھتے تھے ا۔

ہرگز نہ مستقبل سمجھ اس انقلاب کو رکھ راہ راست بھٹکنے دے انقلاب کو

اقبال، تاوک چند محروم سے صرف تیرہ سال بڑے تھے اور ۱۹۰۱ء کے لگ بھگ جب محروم نے اپنی آواز کو پانا شروع کیا، اقبال یورپ میں تھے اور اپنی "ہمالہ" اور "نیا شوالہ" والی روش ترک کر چکے تھے۔ درگا سہائے سرور جہان آبادی، اقبال سے دو سال بڑے تھے، اسی لحاظ سے قومی اور وطنی شاعری میں وہ اقبال کے پیش رو تھے لیکن ابھی ان کی "خاکِ وطن"، "عروسِ حب وطن" اور "بادِ ہند" جیسی نظمیں فضا میں گونج رہی تھیں کہ انھیں جوانی کے بدلے موت ہی آئی (۱۹۱۰ء)۔ اسمٰعیل اس زمانہ میں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ چکبست البتہ ابھی جوان تھے اور قومی شاعری کے افق پر ان کی آواز ایک روشن ستارے کی طرح نئی بشارت کا پیغام دیتی ہوئی ابھر رہی تھی۔ غرض کہ اس زمانہ میں جب محروم کی شاعری اپنی سمت کا تعین کرنے لگی اس کے سامنے سرور اور اقبال کی چند نظموں یا چکبست کی ابھرتی ہوئی آواز کے علاوہ اور کوئی نشانِ راہ نہ تھا۔ محروم نے انھیں چراغوں سے چراغ جلایا اور اپنی لے کو خوب سے خوب تر بنانا شروع کیا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری میں ملکی اور قومی عنصر پر ایسے نازک وقت میں توجہ دی جب اکثر اردو شاعر اپنے قومی منصب سے بے خبر تھے اور اردو شاعری آزادی کے شعور سے پوری طرح آشنا نہ ہوئی تھی۔ محروم کی ابتدائی شاعری میں بھی کہیں کہیں حبِ وطن کا جذبہ وقتی مصالح کے تحت دب گیا ہے لیکن مجموعی طور پر اس کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

دوسری جنگِ عظیم سے لے کر حصولِ آزادی تک ہماری تحریکِ آزادی کے کئی موڑ کے کئی موڑ ہیں۔ ان تمام سفر کی داستان، سود و زیاں کی اور امنگ اور عزم کی پوری تفصیل کے ساتھ محروم کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک آزادی کی تحریک تعلیم یافتہ طبقے اور صنعتی منافع خوروں کے ہاتھوں میں تھی یہ لوگ انگریزوں کی انصاف دوستی کے قائل تھے اور قوم و ملک کی ترقی کے لئے ان سے اصلاحی نوعیت کی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے قرنِ اول میں انگریزوں کی بدنیتی کا راز کھلنے لگا اور حریت پسندوں کی بڑی تعداد سمجھوتے کی روش سے ہٹ کر تشدد آمیز طریقوں پر اتر آئی اس زمانہ میں شدید قحط پڑا اور پلیگ کی وبا سے لاکھوں جانیں تلف ہوگئیں۔ تقسیم بنگال اور لارڈ کرزن کی بدعنوانیوں نے عوام کو مشتعل کر دیا تھا اور ملک بھر میں دہشت پسندوں کی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ حکومت نے ان تحریکوں کو کچلنے کی جتنی کوشش کی یہ اتنا زیادہ بڑھیں۔ ۱۹۱۶ء میں ہوم رول لیگ کی ابتدا ہوئی۔ ۱۹۱۸ء ہندوستانیوں کی بددلی میں اضافہ کرنے کے لئے مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات شایع ہوئیں۔ غم و غصہ کی اس آگ پر تیل ڈالنے کا کام رولٹ بل نے کیا۔ اس کے خلاف ہندوستان کے سب طبقوں نے متفقہ طور پر احتجاج کیا۔ جگہ جگہ ہڑتالیں ہوئیں، مظاہرے کئے گئے اور جلوس نکالے گئے۔ پنجاب میں اس کا زیادہ زور گجرانوالہ، قصور اور امرتسر میں تھا۔ امرتسر میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ میں ایک پرامن جلسہ پر جنرل ڈائر نے گولیوں کی باڑ جھونک دی۔ چار سو آدمی وہیں ڈھیر ہوئے اور ایک ہزار سے زاید زخمی ہوئے اس واقعہ نے ملک بھر میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کی برقی رو دوڑا دی۔ ہزاروں گرفتاریاں عمل میں آئیں اور سیکڑوں کو پھانسی ہوئی۔ اس کے دو ماہ بعد تک مارشل لا نافذ رہا۔ پنجاب میں خبروں کے سنسر کی یہ حالت تھی کہ جلیانوالے باغ کے حادثے کی اطلاع لندن میں آٹھ مہینوں کے بعد پہونچی۔ اس حادثے کا اثر ہندوستان میں یہ ہوا کہ اس کے بعد سے تحریکِ آزادی کا دہانہ جیسے یکلخت کئی گنا چھوٹا ہوگیا اور ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگ آزادی کی تحریک میں شامل ہوگئے۔

جلیانوالے باغ کا حادثہ ہمارے آزادی کے سفر کا ایک بڑا ہی دردناک واقعہ ہے۔ شہید ہونے والے چار سو ہندوستانیوں نے قربانی کی جو مثال قایم کی تھی اس ایک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے اور تحریکِ آزادی کی رفتار دفعتاً کئی گنا تیز ہوگئی۔ شاعر قوم کی آواز ہوتا ہے، محروم اس حادثے کی جائے وقوع سے زیادہ دور نہیں تھے۔ انھوں نے اس سے جو اثر لیا، بہت کم شاعروں نے لیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے تین چار نظمیں کہیں، سب نظمیں انگریزوں سے نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی ہیں، اور ان کے ظلم و استبداد کے خلاف دردناک احتجاج

ہیں۔ ان میں سے ایک میں محروم، جنرل ڈائر کو سعدی کا وہ نکتہ سعدی ہی کے لفظوں میں سناتے ہیں جو انھوں نے گلستاں میں ظلم کے بارے میں بیان کیا ہے۔ ایک اور نظم میں محروم کہتے ہیں کہ جنرل ڈائر کے سفاکانہ قتل کے سامنے نادر شاہ کا قتل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ خود محروم کی زبانی سنئے:۔

نادر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک
سفاک اس کا نام ہے مشہور آج تک

لیکن ہے جور نادرِ سفاک سے سوا
ڈائر کے قتلِ عام کا پر ہول ماجرا

اس نے کیا تھا قتل رعایائے غیر کو
جو ہو چکی تھی جنگ میں خود اسکے روبرو

ڈائر نے قتلِ عام کیا اس مقام پر
مرتے جہاں ہیں لوگ اطاعت کے نام پر

یورپ لہو سے جن کی ابھی لالہ زار ہے
اب تک ہوائے دشت میں جن کا غبار ہے

ان ہی کے بھائی بند تھے اس باغ میں جہاں
ساون کے بادلوں کی طرح برسیں گولیاں

شامل تھے ان میں پیر بھی اور خورد سال بھی
دل میں کسی کے تھا نہ خطر کا خیال بھی،

میلہ سمجھ کے باغ میں داخل ہوا کوئی
جگھڑے عجیب جان کے شامل ہوا کوئی

نکلا تھا کوئی لوٹنے لطفِ بہار کو
آغوش میں لئے تھا کوئی شیر خوار کو

تھی درمیان باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ
ناگاہ اک طرف سے چلی گولیوں کی باڑ

پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جان
پتھر کا دل بناؤں تو کچھ ہو سکے بیان

ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا
لوہو سے لال دامنِ برطانیہ کیا

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ ہندو مسلم اتحاد کے عروج کا زمانہ تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ نے ترکی کے خلاف علم جنگ بلند کیا، اس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت پھیلی اور انگریزی حکومت کو ہندوستان سے ختم کرنے میں وہ کانگرس کے ہم نوا ہو گئے۔ اس اتفاق سے خلافت تحریک کا آغاز ہوا جس نے انگریز دشمنی اور آزادی کے جذبے کو ملک کے کونے کونے تک پہونچا دیا۔ ہندو مسلمان دونوں کو احساس ہونے لگا کہ ان دونوں کی متفقہ طاقت میں کتنا اثر ہے لیکن محبت اور آشتی کی یہ فضا زیادہ دیر قایم نہ رہ سکی۔ انگریزوں کا پھوٹ ڈلوا کے حکومت کرنے کا جو حربہ مدت سے کمزور پڑ گیا تھا پھر پوری شدت سے اپنا کام کرنے لگا۔ ترک موالات کے دوران ہندو مسلمانوں کے فرقہ وارانہ اختلافات سطح کے نیچے چلے گئے تھے لیکن اس کے ختم ہوتے ہی پھر نمودار ہوئے اور دونوں قوموں میں کشیدگی بڑھنے لگی ان حالات میں محروم نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا:۔

آہ پھر بزم وطن میں شورشِ بیہودہ ہے
ہر مسرت وقفِ غم ہر عیش خوں آلودہ ہے

اتحاد ان کو گراں ہے اور نفاق انکو عزیز
ایک مقصد ہے مگر ہے افتراق ان کو عزیز

جب کہیں تدبیر لڑ پڑتی ہے تو لڑ پڑتے ہیں یہ
جب ذرا تقدیر بنتی ہے بگڑ پڑتے ہیں یہ

کاش انھیں کو دے کوئی سرمست جامِ صلح کل
لائے نانک کی طرح کوئی پیامِ صلح کل

ہندوؤں اور مسلمانوں میں اخوت اور اتحاد بڑھانے کے لئے محروم نے کئی نظمیں کہی ہیں ان میں انگریزوں کی حکمت عملی کی طرف اشارے ہیں، نفاق کی برائیوں اور اتفاق کی خوبیوں کا بیان ہے اور متحد ہو کر آزادی کی جنگ جیتنے کی بشارت ہے "ہندو مسلمان" محروم کی ایک طویل نظم ہے اس میں بتایا ہے کہ اگر ہم غافل، بے خبر اور بے غیرت ہیں تو ہمیں ہندوستانی کہلانے کا کوئی حق نہیں۔ ہندو یا مسلمان صرف وہی ہے جس کا کردار صالح ہے اور جس کے دل میں مذہب کی محبت کے ساتھ ساتھ وطن کی محبت کا جذبہ بھی موجزن ہے۔

ہندو مسلمانوں کے اس انتہائی نفاق کے زمانہ میں ہندوستان میں سائمن کمیشن کا ورود ہوا (۱۹۲۸ء) اس کی تجاویز سے چونکہ آزادی کے راستے میں الجھنیں پڑتی تھیں، وطن دوستوں نے اس کا بائیکاٹ کیا، اس کے برعکس کچھ انگریز نواز سیاسی پارٹیوں نے کمیشن کے استقبال کی طیاریاں کیں۔ سیاسی انتشار کے اس زمانہ میں مخدوم نے جو نظم کہی، ملک کی بدحالی اور ہندو مسلمانوں کے نفاق کا دل سوز نوحہ ہے:۔

ہے مشہور ہندوستاں کا نفاق — مرض ہوگیا ہے پرانا نفاق
عجب لوگ ہیں اہلِ ہندوستاں — نہیں جانتے اپنا سود و زیاں
نہیں متفق یہ کسی بات پر، — تلے رہتے ہیں اختلافات پر
نہ لیڈر یہاں کے بہم متفق — نہ پبلک نہ اہلِ قلم متفق،
کمیشن کے آنے پہ برپا ہے شور — دکھاتی ہے ہر پارٹی اپنا زور

کوئی کہہ رہا ہے کہ آ سائمن
کوئی چیختا ہے کہ جا سائمن

انگریزوں کی متواتر وعدہ خلافیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی تحریک بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ گاندھی، اروِن پیکٹ منظور کرلیا گیا اور مہاتما گاندھی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے لندن گئے۔ وہاں فرقہ وارانہ انتخاب کے مسئلہ پر کونسل کے اراکین سے اختلاف ہوا اور کانفرنس کامیاب نہ ہوسکی۔ انگریز فتحِ بنگال کے زمانہ سے ہندوستانیوں میں باہم تفرقہ ڈال کر ان کے استحصال کی جس پالیسی پر چل رہے تھے اس کا تقاضا یہی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ نفاق پھیلایا جائے چنانچہ ان کے اتحاد کے تابوت میں آخری کیل کمیونل اوارڈ دے کر گاڑی گئی۔ جو ۱۹۳۳ء میں کانگریس کی شدید مخالفت کے باوجود ہندوستان میں نافذ ہوگیا۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کی طرح پنجاب میں بھی وطن پرستوں نے کمیونل اوارڈ کے خلاف آواز اٹھائی اقبال اس وقت لاہور میں تھے۔ انھوں نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور اسے دیوانہ پن کا نام دیا۔ مخدوم کا یہ شعر اسی تلخیِ دوراں سے عبارت ہے:۔

تلخیِ فرقہ ہر روز بڑھی جاتی ہے — فرقہ داری کا نتیجہ نظر آتا ہے تجھے

اس میں شک نہیں کہ کمیونل اوارڈ نے آزادی کے قریب آتی ہوئی منزل کو دور تر کر دیا اور فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے میں مدد دی۔ مخدوم نے ان سیاسی حالات کا تجزیہ اپنی ایک نظم میں یوں کیا ہے:۔

بھڑکی ہے اس سے فرقہ پرستی کی آگ اور — ہر فرقہ اپنی ڈفلی پہ گاتا ہے راگ اور
ڈھیلی ہوئی کمند عداوت کی ہاگ اور — پھنکارتا ہے آج تعصب کا ناگ اور
ہے اس کے منہ میں زہر کمیونل اوارڈ کا — ہندی ہیں اور کمیونل اوارڈ کا

۱۹۴۲ء میں آزادی کی تحریک نے نہایت شدید صورت اختیار کی ملک بھر اور خصوصاً بنگال میں دہشت پسندوں نے انگریزی اقتدار کو زک پہونچانے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔ اس موقع پر انگریزوں کی انصاف پسندی اور رعایا پروری کی اس سے بہتر مثال کیا ہوگی کہ بنگال میں شدید ترین قحط رونما ہوا اور یہاں کے عوام کا بڑا حصہ تڑپ تڑپ کے بن آئی موت مرگیا۔ دیدۂ عبرت نگاہ کو یہ صدمہ تازیانے سے کم نہ تھا۔ مخدوم بھی دل کے درد کے ہاتھوں تلخ نوائی پر مجبور ہوئے اور قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

اے مست مئے بے خبریِ حالِ جہاں دیکھ — سرحد تھا ہے یہی، پہونچا ہے کہاں دیکھ
کیا اہلِ وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے — بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے

سفاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری — یہ جور ہے ناکردہ گناہی پہ ہماری
بنگم کے ترانوں کا وطن نالہ کناں ہے — ٹیگور کے نغموں کا چمن وقفِ خزاں ہے
جس خطہ سے اُٹھی تھی صدا حبِ وطن کی — ملتی ہے اسے آج سزا حبِ وطن کی
ٹوٹا نہ اگر حلقۂ زنجیرِ غلامی — اس سے بھی خطرناک ہے تقدیرِ غلامی

مخدوم کی سیاسی شاعری سے متعلق اہم ترین بات یہ ہے کہ تحریک آزادی کے مایوس سے مایوس لمحوں میں بھی انھوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اس نصف صدی میں ملک ایسے ایسے مرحلوں سے گزرا کہ بڑے بڑوں کے حوصلے پست ہوگئے لیکن مخدوم کی شاعری میں کہیں بھی بے دلی یا حوصلہ شکنی کے آثار نظر نہیں آتے ہیں۔ جگہ جگہ انھوں نے یقین کی شمع کو روشن رکھا ہے اور آزادی کی تصویر پیش کرتے ہوئے آنے والے بہتر دور کی بشارت دی ہے۔ مثال کے طور پر "شعاعِ امید" کے یہ اشعار دیکھئے :۔

جلوۂ صبحِ یقینی ہے شبِ تار کے بعد — دورِ اقبال ہے ہر قوم کو ادبار کے بعد
چھوڑ مت دامنِ امید مصائب میں کہ ہے — دستِ گل چیں میں گلِ تر خلشِ خار کے بعد
جہدِ ہستی سے نہ گھبرا کہ نمایاں ہوگا — دورۂ امن و اماں گرمیِ پیکار کے بعد

حبِ وطن سے سرشار ہو کر مخدوم نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں سے "صبحِ وطن" "اپنا وطن" اور "خاکِ وطن" خاصے کی چیزیں ہیں۔ "خاکِ وطن" کے چند شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ آخری شعر میں جو رمز ہے، لطفِ بیان کا معجزہ ہے :۔

پیدا ہے تیرے سبزہ و گل سے بہارِ خلد — کرتے نہیں ہیں تیرے مکیں انتظارِ خلد
لیل و نہارِ ہند میں لیل و نہارِ خلد — طالب جو ہے تیرا نہیں منت گزارِ خلد
ہر چند وہ سماں نہیں اور وہ نہیں ہے تو
پھر بھی زمیں پہ رشکِ بہشتِ بریں ہے تو

آزادی کی خیر و برکت کا احساس کرانے اور اس کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں مخدوم نے جو نظمیں کہی ہیں ان میں مثنوی "تصویرِ غلامی" اہم مقام رکھتی ہے۔ ساٹھ، ستر اشعار کی اس مثنوی میں مخدوم نے فلسفۂ غلامی کو عام فہم اور نہایت دلچسپ انداز میں نظم کیا ہے۔ آخر میں بتایا ہے کہ غلام قوم کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب کوئی مردِ مجاہد اپنے عمل اور سوزِ یقین سے مردہ قوم میں پھر سے جانِ پھونک دیتا ہے۔ مثنوی کے شروع میں غلامی کی مذمت کی ہے اور اس کی لعنتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے آزادی کی نعمتوں کا احساس دلایا ہے :۔

ہے مصدرِ صد گونہ غلامی — جس سے ہو ذلیل ہر گرامی
افراد ہیں بے وقار اس سے — اقوام ذلیل خوار اس سے
شیروں کو کیا ہے اس نے روباہ — جو کوہ گراں تھے ہو گئے کاہ
مر جاتے ہیں مدرکاتِ علوی — دب جاتی ہیں سب صفاتِ علوی

شہباز اور شیر کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں :۔

انساں بھی یونہی غلام ہو کر
رہ جاتا ہے جوہر اپنے کھو کر

غرض ان لعنتوں کے خلاف نصف صدی سے ملک میں جو تحریک جاری تھی، کامیاب ہوئی۔ وطن آزاد تو ہوا لیکن ٹکڑے بھی ہوا۔ اس تقسیم سے جو چنگاریاں اُٹھیں تو کتنے ہی مہینوں تک سارا کا سارا ملک شعلہ و رہا۔ ہا۔ مخدوم نے اپنی نظم :۔

"ناخدائے بے مروت" میں ان حالات کا کتنا صحیح اور موثر جایزہ لیا ہے :-

آخری ٹھوکر سے ٹکڑے کر دئے اس ملک کے — یا اس برتن کے جس برتن میں خود کھا کر گیا
پھوٹ کی کل سے حکومت کی دیارِ ہند پر — جب چلا تو اور بھی اس کل کو چلتا کر گیا
چار جانب آتشِ کین و حسد بھڑکا گیا، — محشرِ جور و ستم ہر سمت برپا کر گیا
ہند کی کشتی کو چھوڑا حلقۂ گرداب میں — ناخدائے بے مروت خود کنارا کر گیا

صدیوں کے مشترکہ تہذیب و تمدن پر تو قیامت گزر گئی - باہمی اخوت اور محبت کے سرچشمے بھی خاک ریز ہو گئے - لیکن وطن لاکھ تقسیم ہو، پھر بھی وطن ہے :-

باغ ہیں اُجڑے ہوئے گلیاں ہیں شہروں کی اُداس — قتل گاہیں بے بسوں کی ہیں ابھی خونیں لباس
جانور سہمے ہوئے اور انساں وقفِ یاس — دور چہروں سے نہیں اب تک ہوا خوف ہراس،
وہ بھی لرزاں ہیں جنھوں نے چوٹ کچھ کھائی نہیں — کشورِ پنجاب کو تقسیم راس آئی نہیں

انقلاب کے بعد جب پرانا نظام شکست و ریخت ہو جاتا ہے تو نئے کو اس کی جگہ لینے میں کچھ دیر لگتی ہے، چنانچہ اس گزران دور میں محروم آزادی کی شب گزیدہ سحر کو دیکھ کر اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے - ان کے لئے دل کے داغوں سے کہیں اہم وہ اُجالا تھا جو اپنے جلو میں قوم کے لئے نئی بشارتیں لا رہا تھا - اس احساس کے تحت محروم نے آزادی کا استقبال یوں کیا :-

بلندی پہ ہے آج اپنا ستارا — وہ پستی جو تھی ننگِ ہستی کہاں ہے
کہ لطفِ خدائے جہاں آفریں سے — زمینِ وطن رشکِ آسماں ہے
گیا وہ زمانہ کہ محکوم تھے ہم — ستم دیدہ بدحال مظلوم تھے ہم
اب آزاد ہیں اور دل شاد ہیں ہم — کہ آزاد و آباد ہندوستاں ہے

غرض ۱۹۴۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کی قومی تحریک کو محروم کی شاعری کے آئینے میں دکھانے کی یہ ایک سرسری سی کوشش تھی - اس کا مقصد محروم کی شاعری کے اس پہلو کو بے نقاب کرنا تھا جس پر ابھی زیادہ لوگوں کی نظر نہیں گئی - محروم کی شاعری میں حکیمانہ اقوال اور اخلاقی نکتوں کی افراط سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک اخلاقی شاعر ہیں حالانکہ یہ ان کے رنگِ سخن کا صرف ایک ہی پہلو ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا، محروم کی شاعری کا آہنگ محض انفرادی نہیں بلکہ وہ سماجی اور اجتماعی قدروں کا ساتھ دیتا ہے - چنانچہ اسکے نزدیک اخلاقی قدروں کا فروغ ہی سب کچھ نہیں، آزادی کا حصول اور اس کے استحکام کی تمنا بھی اہمیت رکھتی ہے - اخلاقی قدریں دراصل ذریعہ ہیں ایک اعلیٰ مقصد کا - ہندوستان میں ہم روحانی ترقی سے الگ ہو کر مادی خوش حالی کو بے معنی سمجھتے ہیں - بہتر زندگی اور بہتر مستقبل کی بنیاد اعلیٰ انسانی اور روحانی قدروں پر ہی رکھی جاتی ہے - غلامی ان سب کی نفی ہے - اس کے برعکس آزادی انکے پنپنے کے لئے صحیح ماحول پیدا کرتی اور ان کے فروغ و بقا میں معاون ثابت ہوتی ہے - چنانچہ محروم کی شاعری میں بھی آزادی کی تمنا کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے یہی وہ نکتہ ہے جس کی مدد سے محروم کی آواز کو پہچاننے میں مدد ملتی ہے اور ان کے دل کے راز تک رسائی ہو سکتی ہے -

توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی جس میں ۵۱ھ سے ۹۳۲ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بقید سنہ ہجری یکجا کر دئے گئے ہیں - تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے - قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول -

منیجر نگار لکھنؤ

شبلی کی عشقیہ شاعری پر چند خیالات

(مفتون احمد)

مولانا شبلی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے مگر اُن کی عشقیہ شاعری زیادہ تر فارسی میں ہے۔ اُن کی ابتدائی غزلیں جو علی گڑھ کے قیام کی یادگار ہیں وہ بقول خود انھوں نے تنہائی سے گھبرا کر لکھی ہیں۔ اُس وقت وہ جوان تھے۔ یہ زمانہ یوں بھی شعر و شاعری اور جذبات کا زمانہ ہوتا ہے۔ اُس وقت چند محبت بھری نگاہوں، تھوڑی سی رعنائیت اور ایک طرح کی بے چینی کا جو اندوختہ جمع ہو جاتا ہے اُس سے بھی مدد ملتی ہے چنانچہ مولانا کی اُس دور کی غزلیں محض رسمی عاشقانہ اشعار نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبت سے مولانا کا دل کبھی خالی نہیں رہا ہوگا کہ یہ چیز ان کی شاعرانہ فطرت میں داخل تھی۔ یہ محبت صرف ایک عورت کی محبت نہیں تھی بلکہ بنی نوع انسان کی محبت تھی۔ اس میں بڑا سوز اور بڑی گرمی تھی۔ ان کی ایک بڑی پرانی مثنوی ہے جس میں کسی دوست کی جدائی پر اظہارِ خیال ہے۔ اس کو اپنے عہد و پیمان یاد دلائے گئے ہیں، اور اُن دنوں کو یاد کیا گیا ہے جو دونوں نے ایک ساتھ گزارے اور اکثر اوقات شعر و سخن کی محفلیں بھی گرم کیں۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:۔

اے پسر از چہ رمیدی از ما ؟ — باز گو تا کہ چہ دیدی از ما ؟
گفتۂ ترکِ وفا یعنی چہ ؟ — باختی نرد وفا یعنی چہ ؟
گرچہ دور از تو چہا دیدہ استم — ہم براں عہد و مواعید استم
تو بہ یک دم زدن اے مہ رخسار — گشتۂ چوں من از من بیزار
وقت ہا بزم سخن ساختمی، — طرح بیت و غزل انداختمی
من بہ تو با دل ماتم زدۂ، — خستۂ، سوختۂ، غم زدۂ
بے حجابانہ ہم از سر ذوق، — عرض می داشتے حالت شوق
ہم تو پابندہ بجوشِ مستی — عہد و پیمانِ وفا می بستی

وطن سے رخصت ہوتے ہوئے وہ یہ اشعار کہتے ہیں اور پھر انھیں محفلوں کو یاد کرتے ہیں:۔

تا نہ پنداری کہ خرّم می رویم — از وطن با چشم پرنم می رویم
از گداز شعلۂ غم ہمچو شمع — بزم ہا را گردہ برہم می رویم
از فریب مار گیسوئے کسے — زیں جناں مانند آدم می رویم

اس کے بعد مولانا وطن سے دور جا پڑتے ہیں اور ان کی توجہ شعر و شاعری سے ہٹ کر تصنیف و تالیف اور قومی بیداری کی جانب مبذول ہونے لگتی ہے چنانچہ ۱۸۸۵ء کی ایک ناتمام مثنوی میں روایتی عشقیہ شاعری کی اس طرح مذمت کرتے ہیں:۔

تا چہ خواہی ز شاعری یعنی، — چند ازیں ترہات بے معنی

داستاں ہائے پاستاں تا چند — شکوۂ جور آسماں تا چند
دل بہ فکر محال خوں کردن — وحشت آموختن جنوں کردن
سخن عشق ہر زۂ چند است — چاک را با جگر چہ پیوند است
ایں چہ خواریست عشق ورزیدن — سادہ را بہ جاں پرستیدن
خواہ بہ بیں ارزش بتاں چہ بود — پیکرے سادہ جانِ جاں چہ بود
خواہم اکنوں عناں بگردانم — رسمِ پیشینیاں بگردانم
رسمِ دیرینہ را بر اندازم — در سخن طرح دیگر اندازم

چنانچہ ۱۹۰۶ء کے قریب قریب جب مولانا نے پھر سنجیدگی سے فارسی غزلیں کہنی شروع کیں تو اس رسم دیرینہ کے باوجود انکی شاعری میں بڑی واقعیت تھی جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے :۔ " میں نظم پر باوجود ہزاروں شعر کہنے کے بالکل قادر نہیں۔ یعنی بغیر کسی خاص فوری تاثر کے ایک حرف نہیں لکھ سکتا " اُن کی عشقیہ شاعری پر خواجہ حافظ کی گہری چھاپ ہے۔ فرماتے ہیں :۔

گر خداوندی ہوس داری در اقلیم سخن — بندگیٔ حافظ شیرازی بایست کرد

چنانچہ مولانا حالی جیسا نقاد بھی اُن کی غزلوں کے بارے میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ " غزلیں کاہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہے جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی کے مضامین پر مشتمل ہے ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دلربائی ہو مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں "۔ اس کی وجہ در اصل بمبئی کا وہ دلچسپ اور مشہور صحبتیں ہیں جنھوں نے شاعر کو کچھ تاثرات بہم پہونچائے ہوں گے اور جن کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے (غالباً مولانا حالی کو بھی، جبھی تو انھوں نے اس شراب دو آتشہ کے نشہ میں خمار چشم ساقی کا ذکر کیا ہے)۔ بمبئی کی یہ تصویر دیکھئے جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ اشعار کلکتہ کے بارے میں غالب کی اُس مشہور غزل کی یاد دلاتے ہیں :۔

کلکتہ کا جو کیا ذکر تو نے ہم نشیں — اک تیر میرے سینہ میں مارا کہ ہائے ہائے

شبلی کے چند اشعار یہ ہیں :۔

نثارِ بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را — طرازِ مسند جمشید و فرِ تاج خسرو را
بہر سو از ہجوم دلبرانِ شوخ بے پروا — گزشتن از سر رہ مشکل افتادست رہرو را
فغاں از گرمیٔ ہنگامۂ خوباں زہ دشتی — بہم آمیختہ از زلف و عارض ظلمت و ضو را
بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت — کنار آب چو پائی و گلگشت لب جو را

یہ قدرتی بات ہے کہ تیس سال کے تقوٰی کے بعد جب شاعر رندی و عاشقی کے کوچہ میں آتا ہے تو یہ تضاد اسے بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اس کی تاویل کے لئے پہلے تو وہ یہ کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں، مجھے شباب میں بھی اس کا تجربہ ہو چکا ہے :۔

حالیا من ہمچو زاہد پارسائی شیوہ ام — بادہ خوردن در شبا ہم اتفاق افتادہ بود
گرچہ من مرد ہوس بازی و رندی نیستم — ایں چنیں ہم گاہ گاہ اتفاق افتادہ بود

پھر کہتا ہے کہ میرا کمال یہ ہے کہ میں نے زہد کو بھی آشنا کر دیا ہے :۔

زہد را من آشنائی دادہ ام با عاشقی — ورنہ عمری ہر دو را با ہم نفاق افتادہ بود

رندی و پارسائی در اصل متضاد نہیں ہیں۔ پارسائی صرف مذہبی رسوم کے ادا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ وہ کیفیت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے محبت اور آشتی اور اس کی کمزوریوں کے ساتھ ہمدردی برتنا سکھاتی ہے، جو فروعی چیزوں کو چھوڑ کر بنیادی

باتوں پر توجہ دیتی ہے اور جو ایک تصور کے لئے جینا اور مرنا سکھاتی ہے۔ شبلی کہتے ہیں :۔

زاہد و رند ہر دو در کار اند شبلی آں بودہ است وایں باشد

ایک ترکیب بند میں جو سفر روم سے واپس آنے کے بعد علی گڑھ میں پڑھا گیا مولانا نے اپنی اس ہمہ جہت شخصیت کو بے نقاب کیا ہے اور صاف صاف یہ کہا ہے کہ اس سفر میں جہاں انھوں نے فقیہوں اور دانشوروں سے ملاقات کی وہاں قاہرہ میں چھپ چھپ کے تھیٹر وغیرہ بھی دیکھتے رہے :

گاہ در بزم فقیہانِ گراں مایہ رسید گاہ با دیدہ وراں پردہ در راز آمد
گاہ در بیت مقدس بہ برِ مفتیٔ شہر از رخ شاہد فن پردہ بر انداز آمد
گاہ در قاہرہ پنہاں بہ تقاضائے ہوس بہ تھیٹر شد و در جلوہ گہ ناز آمد

اسی قبیل کے چند اور اشعار سنئے :۔

کار مستوری و شاہد طلبی ہر دو خوش است شکر ایزد کہ ہم ایں کردم و ہم آں کردم
از زہد دروغ چند بفروختہ ام خلقے اے دوست چہ می پرسی تا من چہ ہنر دارم

سوادِ بمبئی سے دور رہ کر وہ صرف شبلی رہ جاتے ہیں، رند غزل خواں نہیں رہتے :۔

شاعری از من مجو دور از سوادِ بمبئی حالیا شبلی شدم رند غزل خواں نیستم

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں شبلی کی عشقیہ شاعری میں بڑی واقعیت ملتی ہے۔ غالب کی طرح ان کے یہاں موشگافیاں نہیں ہیں اور نہ انھوں نے عشق کو ایک ذہنی مشق یا مشغلہ بنایا ہے۔ ان کے اشعار میں بمبئی کی تعریف، زہد اور رندی کا مقابلہ اور بعض مسلسل غزلیں حاشیۂ خیال کے لئے کوئی ایسی بات نہیں چھوڑتے جسے دریافت کرنے کے لئے دور جانا پڑے۔ ان کے یہاں وہ تاریکی نہیں جس پر بقول گوئٹے لوگ فریفتہ ہو جاتے ہیں۔ بعض جگہ ان کی صاف گوئی کا یہ عالم ہے :۔

من خدائے بت شوخے کہ بہ ہنگام وصال بہ من آموخت خود آئین ہم آغوشی را

اکرام نے لکھا ہے کہ :۔ "اس قسم کے اشعار کو شبلی کے لکھنوی مذاقِ شعر کا نتیجہ سمجھنا چاہئے" اس ضمن میں اول تو یہ مسئلہ ہی بحث طلب ہے کہ شبلی کا مذاق شعر لکھنوی تھا یا نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ شبلی کے ان اشعار میں وہ ابتذال اور رکاکت نہیں ہے جس کی طرف اکرام اشارہ کرنا چاہتے ہیں اور جو لکھنؤ کی شاعری سے منسوب ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں جو ابتذال ہے وہ در اصل معشوق کو نہ پانے اور اس کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عشق تو ہوا ہو جاتا ہے اور اس کے چند خارجی اور سطحی لوازمات رہ جاتے ہیں، لیکن شبلی کے اس شعر میں عشق کا ایسا بھرپور اظہار ہے جس کے لئے لکھنؤ کے شعراء ترستے ہی رہ گئے ہوں گے۔ چند اور شعر سنئے :۔

رسم و آئین ہم آغوشی نمی دانم کہ چیست دست گستاخ انچہ فرمود است من آں کردہ ایم
مست و پر عربدہ تنگش بکشم در آغوش تشنۂ وصلم و تا کے بہ محابا باشم
من بر آنم کہ کنار از ہمہ عالم گیرم گر مرا یک صنمے شوخ در آغوش آید
شبِ وصل است حیا گر بگذاری چہ شود یک دلم تنگ در آغوش فشاری چہ شود
تو بدیں حسن تو نگر چہ زیاں برداری ایں دو بوسہ تو اگر خود فشاری چہ شود
از تو ناید گرہ بند قبا وا کردن اگر ایں عقدہ بہ من باز سپاری چہ شود

رہا یہ سوال کہ ان اشعار کے پیچھے کون جلوہ فرما ہے، سو اس سلسلہ میں بھی چند واضح اشارے ملتے ہیں جن سے انکار کرنا مشکل ہے۔ مثلاً :۔

آں شدائے دوست کہ در ندوہ بہ بینی بازم — کہ دم از صحبت آں دشمنِ ایماں زدہ ام

ایک دو غزلیں تو ایسی ہیں کہ جن کے پڑھنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی یادگار موقع پر لکھی گئی ہوں گی۔ چند اشعار یہ ہیں:-

یک سر و صد گونہ سودائے نہانے داشتم — یاد آں روزے کہ من با خود جہانے داشتم
یاد آں روزے کہ دور از ماجرائے جہاں — ماجرائے با نگارِ نکتہ دانے داشتم
شبلیا آں جلوۂ نیرنگہائے بمبئی — بود تا دمے کہ من خواب گرانے داشتم
نسیم صبح بیار رحمتے بہ جاں برساں — پیام بندہ بہ آں خاک آستاں برساں
سلام شوق و تمنا ز بندہ نعمانی — بہ ساکنان در او یگاں یگاں برساں

جب بمبئی کے لوگ یورپ کے سفر سے واپس آئے تو یہ غزل کہی گئی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:-

پیک فرخندہ قدم مژدہ سرا می آید — کز سفر یار سفر کردۂ ما می آید
رخت از شہر بداں سان کہ بہاراں ز چمن — آمد آں گونہ کہ در باغ صبا می آید
گوئیا یوسف گم گشتہ بہ کنعاں آمد — یا نگار یمنی سوئے سبا می آید
بوئے جانے کہ مشام دل و جاں تازہ کند — می نواں یافت کزاں بند قبا می آید

حافظ کی طرح شبلی کی غزلوں کی خصوصیت ان کا جوشِ بیان ہے اور یہاں تک فارسی زبان اور ادب کا تعلق ہے شبلی اس کے بڑے ماہر تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:- "فارسی شاعری کو اصول پر برتا" دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

گرچہ مرا شیوۂ فن ایں نبود — حرف بہ اُردو ز دہن آئیں نبود

یعنی اُردو میں لکھنا میرا قاعدہ نہیں تھا۔ مولانا حامد حسن قادری نے لکھا ہے کہ "فارسی اشعار کہنے میں اس زمانہ میں ان سے زیادہ پُرگو اور بھی تھے۔ زیادہ شیریں کلام کوئی نہ تھا۔" رشید احمد صدیقی کا قول ہے کہ "غزل میں غالب کی پیروی جس شخص نے پہلے کی وہ شبلی تھے۔" چنانچہ غالب کی طرح شبلی کے یہاں بھی فارسی کی بڑی خوبصورت ترکیبیں ہمیں ملتی ہیں اور بحیثیت مجموعی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گویا اہلِ زبان کا کلام ہے۔ غالب ہی کی طرح بچپن ہی میں انھیں عجمی نے بھا گئی تھی اور پھر یہ نشہ کبھی نہ اُتر سکا۔ وہ فلسفی تھے یا نہیں یہ تو معلوم نہیں مگر یقول خود انھوں نے فلسفہ بڑی محنت اور تدقیق سے پڑھا اور مدتوں اس میں منہمک رہے (علی گڑھ آنے سے پہلے) چنانچہ اُس دور کے اشعار میں اُن کی قنوطیت ان کے فلسفیانہ مزاج کا نتیجہ ہے، مگر غالب ہی کی طرح یہ قنوطیت بھی ایک طرح کا ذہنی تجربہ ہے، اُن کا عقیدہ نہیں ہے۔

بعض نادر کتابیں

(صرف ایک ایک نسخہ موجود ہے)

نظام الملک طوسی - مصنفہ عبدالرزاق کانپوری۔ قیمت علاوہ محصول ۲۵ء
البراکہ ..... " " " ۱۵ء
دیوانِ رند ۴ء

تذکرہ سراپا سخن ۲ء
کلیات مومن ۲ء

یہ تمام کتابیں اگر ایک ساتھ لی جائیں گی تو مع محصول ۱۰ء میں مل سکیں گی۔ چوتھائی قیمت پیشگی آنا ضروری ہے۔

میزان ۲ء

منیجر نگار لکھنؤ

مشکلاتِ غالب

(بہ سلسلۂ ماہ جولائی ۵۰ء)

غزل (۲۲۰)

۱- کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے — بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جائیے

اگر ہم صدا یا آواز بن کر اس دُنیا میں رہنا چاہیں تو صدائے بازگشت کی طرح پہاڑ اسے لوٹا دیتا ہے۔ اس لئے شرارِ جستہ بتا ہمیں کیا ہونا چاہئے۔ اس سوال میں جواب پنہاں ہے اور وہ یہ کہ شرارِ جستہ ہو جانا ہی زیادہ موزوں ہے کہ دفعتاً نمودار ہوتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے۔

۲- بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس — از سرِ نو زندگی ہو کر رہا ہو جائیے

کنجِ قفس کی حالت بالکل بیضہ کی سی ہے جس میں بال و پر کا وجود نہیں، اس لئے جس طرح انڈے کو توڑ کر بچہ نئی زندگی لے کر پیدا ہوتا ہے، اسی طرح ہم کو بھی کنجِ قفس سے نکلنے کے اپنے اندر نئی زندگی پیدا کر کے آزاد ہو جانا چاہئے۔

غزل (۲۲۱)

۱- مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے — موجِ شرابِ یک مژۂ خوابناک ہے

مستی میں غفلت ہوتی ہے لیکن ساقی کی ادائے غفلت پر وہ بھی نثار ہے، یہاں تک کہ جس چیز کو ہم موجِ شراب کہتے ہیں وہ محبوب کی مژۂ خوابناک سے زیادہ نہیں۔ مدعا صرف محبوب یا ساقی کی غفلت شعاری کا اظہار ہے جس کو اس حسن مبالغہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

۲- جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو — جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

میرے دل میں اس کے سوا کوئی آرزو نہیں کہ تیری تیغِ ناز اس کو زخمی کرے اور آرزو کا تعلق چونکہ خیال سے ہے اس لئے گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ تیرے ہاتھوں جیبِ خیال بھی چاک چاک ہے۔

۳- جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ — صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

جوشِ جنوں کا یہ عالم ہے کہ ہمیں دُنیا میں صحرانوردی کے علاوہ کسی اور بات سے دلچسپی باقی نہیں رہی، گویا صحرا نے ہماری آنکھ میں خاک جھونک دی ہے اور اب ہمیں دنیا میں کچھ نظر نہیں آتا۔

غزل (۲۲۲)

۱۔ لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی قیاف کشتۂ لعلِ بتاں کا خواب سنگیں ہے

عیسیٰ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ صرف جنبشِ لب سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے، لیکن وہ لوگ جو لعلِ بتاں کے کشتہ ہیں، ان پر عیسیٰ کی مسیحائی گہوارہ جنبانی کا کام کرتی ہے اور ان کی نیند اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ مدعا یہ کہ جو عشاق معشوق کے لبِ لعلیں کے کشتہ ہیں ان کا چارہ مسیح کے پاس بھی نہیں۔

(غزل نمبر ۲۲۳ صاف ہے)

غزل (۲۲۴)

۱۔ میں بھی ہوں تماشائی نیرنگِ تمنا مطالب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی برآئے

میرا کسی بات کی تمنا کرنا اس لئے نہیں ہے کہ وہ پوری بھی ہو، بلکہ میرا مقصود تو نیرنگِ تمنا کا تماشہ دیکھنا ہے یعنی صرف یہ دیکھنا کہ انسان کیسی کیسی آرزوئیں کرتا ہے اور وہ کس کس طرح ناکام رہتی ہیں۔

غزل (۲۲۵)

۱۔ سیاہی جیسے گر جائے دمِ تحریر کاغذ پر مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

ایک زمانہ تھا جب تصویروں کے ذریعہ سے اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ اس کو سامنے رکھ کر غالب نے ظاہر کیا ہے کہ میری لوحِ تقدیر میں شبِ ہجراں کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ بالکل ایسی ہے جیسے کاغذ پر سیاہی کا دھبہ پڑ جائے۔

شبِ ہجراں کا ذکر غالب نے اس شعر میں بڑے موثر و پاکیزہ انداز سے کیا ہے۔

غزل (۲۲۶)

۱۔ ہجومِ نالہ، حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

"خس بدنداں" ہونے سے اظہارِ عجز مراد ہے۔ کسی زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جب دو فریق میں لڑائی ہو جاتی تھی اور ان میں سے کوئی ایک اظہارِ عجز کرتا تھا تو اس کا سردار فاتح یا غالب فریق کے سامنے دانت میں تنکا دبا کر آ جاتا تھا۔ حیرتِ عاجز (عاجزِ حیرت) ترکیب مقلوب ہے۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ: ہجومِ نالہ کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں آہ و فغاں سے بالکل باز رہتا ہوں اس حالت کو اس نے دوسرے مصرع میں بڑی پاکیزہ تشبیہ سے ظاہر کیا ہے۔ کہتا ہے کہ نیستاں کی بھی بعینہٖ یہی حالت ہے یعنی باوجود اسکے کہ اس میں بے شمار بانسریوں کے بننے کا سامان نظر آتا ہے لیکن وہ کبھی حیرت سے خس بدنداں نظر آتا ہے اور اس پر

خموشی کا عالم طاری ہے۔

۲۔ تکلف برطرف، ہے جانستاں تر لطفِ بدخواہاں نگاہِ بے حجابِ ناز، تیغِ تیز عریاں ہے

جانستاں تر = (زیادہ جان لیوا) ۔ بدخواہاں سے مراد محض معشوق ہیں، مدعا یہ کہ معشوقوں کا لطف اور زیادہ جان لیوا ہے، کیونکہ ازراہِ لطف جب وہ بے حجابانہ نگاہِ ناز ہم پر صرف کرتے ہیں تو وہ اور زیادہ تیغ تیز ثابت ہوتی ہے۔

۴۔ دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دست گرداں ہے

"متاعِ دست گرداں" سے مراد وہ شے ہے جس کی قیمت نقد ادا کی جائے۔ شعر کا مطلب ظاہر ہے کہ اگر ساقی سے سودا کرنا ہے تو یہاں اُدھار سے کام نہیں چلتا، فوراً دل و دیں نذر کر کے سودا کرے۔

۵۔ غم، آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

قلزم = (سمندر) ۔ صرصر۔ (تیز و تند ہوا) ۔ مرجاں = (مونگا) ۔ مونگا سُرخ ہوتا ہے اور سمندر میں پایا جاتا ہے اس حقیقت کے پیشِ نظر غالب کہتا ہے کہ جس طرح سمندر میں مرجاں کا چراغ روشن ہے اسی طرح غمِ عشق آغوشِ بلا میں عاشق کی پرورش کرتا ہے اور ہمارا وجود ایسا ہے جیسے بادِ صرصر میں کوئی چراغ روشن ہو۔ ہجومِ بلا کو "قلزمِ صرصر" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی نادر تعبیر ہے۔

غزل (۲۲۷)

۱۔ خموشیوں میں تماشہ ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

"تماشہ ادا" کو اگر ترکیب توصیفی قرار دیا جائے تو اس کو نگاہ کی صفت قرار دیا جائے گا۔ یعنی "نگاہِ تماشہ ادا" جس کا مفہوم ہوگا "نگاہ قابلِ تماشہ" اور "نکلتی ہے" کا فاعل نگاہ ہوگی۔ لیکن اگر نکلتی ہے کا فاعل ادا کو قرار دیا جائے تو پھر پہلے مصرع کا مفہوم یہ ہوگا کہ خموشیوں میں تیری ادا قابلِ تماشہ ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ غالب اس شعر میں معشوق کی نگاہ کا ذکر نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس کی خاموشی کے لطف کو ظاہر کرنا چاہتا ہے اور اس کا اظہار یوں کرتا ہے کہ تیری خاموشی گویا ایک سرمہ سا نگاہ ہے دل سے نکلی ہوئی اور نگاہ سرمہ آلودہی کا سا لطف دیتی ہے۔

۲۔ فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم صبا جو غنچہ کے پردہ میں جا نکلتی ہے

فشار = (بھینچنا) ۔ اس شعر میں غالب نے شبنم کے وجود کی بڑی پیاری توجیہ کی ہے۔ کہتا ہے کہ غنچہ پر شبنم کے جو قطرے نظر آتے ہیں وہ دراصل صبا ہے جو غنچہ کی تنگیِ خلوت سے پانی پانی ہو گئی ہے۔

۳۔ نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آب تیغِ نگاہ کہ زخم روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

اس شعر میں غالب نے تیغِ نگاہ کی آبداری اور تیزی کا ذکر کیا ہے کہ سینۂ عاشق سے تیغِ نگاہ کی کاٹ کا حال نہ پوچھو بلکہ سینہ

کے زخم کو دیکھو جس میں روزن در کی طرح ایک بڑا روزن پیدا ہوگیا ہے اور اس سے برابر ہوا نکلتی رہتی ہے۔ جب سینہ کا زخم ہوا دینے لگتا ہے تو اسے مہلک سمجھا جاتا ہے۔ زخمِ سینہ کو اس وقت ہوا دینے والا کہتے ہیں۔ جب پھیپھڑے کی ہوا جو ناک اور منہ سے نکلتی ہے، سینہ کے زخم سے نکلنے لگے۔

غزل (۲۲۸)

۱- جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے — نافۂ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے،

اس شعر میں غالب نے زلفِ یار کی خوشبو کا ذکر کیا ہے کہ جب ہوا زلفِ یار کو چھوڑ کر گزر جاتی ہے تو دماغ آہو بھی نافہ کی طرح معطر ہو جاتا ہے۔ یہ شعر کسی اچھی تعبیر کا نمونہ نہیں۔

۲- کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا — آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے

شش جہت = (یعنی تمام عالم یا جملہ کائنات) ۔ اس شعر میں خیال اور الفاظ سب بیدل کے ہیں۔ انسان کائنات پر نگاہ ڈالتا ہے تو حیران رہ جاتا ہے کہ "یہ جلوہ گری کس کی ہے" اور اس انتہائی حیرت کو "آئینۂ فرشِ شش جہت" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۳- ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق — گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے

اس شعر میں غالب نے اپنے شوق کی وسعت و فراوانی کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے کہ میرے غبارِ شوق کو تنگیِ جا کے فشار نے ذرہ ذرہ کر دیا ہے اور ان ذروں نے ایک ایسے جال کی سی صورت اختیار کر لی ہے جس نے وسعتِ صحرا کو بھی اپنے اندر لے لیا ہے۔

۵- چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب — اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

ایران میں رسم ہے کہ جب کوئی سفر کو جاتا ہے تو چلتے وقت اس کی پشت کی طرف آئینہ رکھ کر پانی چھڑکتے ہیں اور اس سے یہ شگون لیا جاتا ہے کہ اس کا سفر خیریت سے ختم ہوگا اور عافیت کے ساتھ گھر لوٹ آئے گا۔

اسی رسم کے پیشِ نظر غالب عندلیب کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ گلشن میں شبنم نہیں ہے بلکہ آئینہ برگِ گل پر پانی چھڑکا گیا ہے اور اس طرح بہار کو رخصت کیا جا رہا ہے، تاکہ وہ پھر خیریت سے واپس آئے۔

۸- اے عندلیب یک کفِ خس، بہرِ آشیاں — طوفانِ آمدِ آمدِ فصلِ بہار ہے

عندلیب سے خطاب ہے کہ اپنے آشیاں کے لئے ابھی سے تنکے جمع کر لے، ورنہ جب بہار آجائے گی تو پھر خشک تنکے کہاں ملیں گے

۹- دل مت گنو اخبر نہ سہی، سیر ہی سہی — اے بیدماغ، آئینہ تمثال دار ہے

بیدماغ = (نافہم) ۔ خبر = (معرفتِ حقیقت) ۔ اپنے سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اے نافہم اگر دل حقیقت معرفت سے بے خبر ہے تو بھی اس کو برا بھلا نہ کہہ کیونکہ اگر یہ حقیقت کا آئینہ دار نہیں تو کم از کم اس میں کچھ تصویریں تو ایسی نظر آتی ہیں جنھیں دیکھ کر ہم کچھ دیر لطفِ تماشہ حاصل کر سکتے ہیں۔

غزل کا رکھ رکھاؤ

(علیم اختر کے مجموعۂ کلام "نکہتِ گل" کو سامنے رکھ کر)

(نقاد)

غزل کہنا مشکل ہو یا آسان، مفید ہو یا غیر مفید، فراری حرکت ہو یا غیر فراری ۔ ہے بڑا نازک کام ۔ بقول آتش "مینا گری" سے کم نہیں ۔

نظموں کی زبان موضوع کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے، لیکن غزل کی زبان، خواہ اس کا تعلق غمِ جاناں سے ہو یا غمِ دوراں سے خالص عشق و محبت کی باتیں ہوں یا کچھ اور ہمیشہ ایک ہی رہتی ہے ۔ نرمی و حلاوت، روانی و بے ساختگی، سپردگی و افتادگی نغمہ و ترنم اس کے خاص عناصر ہیں حتےٰ کہ اگر عشق و محبت سے ہٹ کر محض ۔ندانہ جوش و خروش، یا معنی آفرینی ہی مقصود تغزل ہو، تو بھی بے ساختگی و ترنم اس کے لئے ناگزیر ہیں ۔

غزل کہنا جذبات کی تشریح و جراحی ہے اور اس کے لئے بڑے نازک نشتر، بڑے سدھے ہوئے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ اس تصویر کے لئے موقلم اور ہاتھ دونوں کو بہت نازک، نرم اور سبک ہونا چاہئے ۔ گویا آپ ایک ایسے نازک کانٹے سے کام لے رہے ہیں جس میں نہ صرف لفظ بلکہ اس کا تلفظ بھی تلتا ہے اور خفیف سے فرق سے توازن خراب ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ آپ کوئی زاید لفظ استعمال کریں یا ضروری لفظ کو نظر انداز کر دیں ۔ یہ چیز زبان کے صحیح استعمال سے زیادہ مشکل ہے اور اس کا تعلق صرف وجدان اور ذوقِ سلیم سے ہے ۔

میں کچھ عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ اس موضوع پر کچھ لکھوں کہ اتفاق سے جناب علیم اختر صاحب کا مجموعۂ نظم "نکہتِ گل" نظر سے گزرا اور اس سلسلہ میں کچھ لکھنے کا موقع مل گیا ۔

اس مجموعہ میں پروفیسر فراق، ڈاکٹر اعجاز حسین، حضرت جگر مراد آبادی اور جناب مانی جائسی کی طویل و مختصر رائیں بھی شامل ہیں اور ان تمام حضرات نے ان کے رنگ تغزل کو بہت سراہا ہے ۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس مجموعہ میں لطیف و پاکیزہ تغزل کے نمونے بھی ملتے ہیں ۔ مثلاً :-

مری نگاہ نے کیا راز کہہ دیا ان سے — حجاب بن نہ پڑا اور عتاب ہو نہ سکا
ہر ایک چیز کو حیرت سے تک رہا ہوں میں — یہ تم ہو سامنے یا خواب دیکھتا ہوں میں
یوں تو بیتابیِ دل اور فزوں ہوتی ہے — آپ میرے لئے تسکین کا ساماں نہ کریں
پھر یہ محفل بھی نہ ہوگی جب نہ ہونگے ہم یہاں — تیری محفل لے کے اٹھیں گے تری محفل سے ہم

جناب اختر تغزل میں حسرت موہانی کے مقلد ہیں اور اس تقلید میں بڑی حد تک انھیں کامیابی بھی ہوئی ہے، لیکن حسرت کی زبان اور طرزِ ادا کی نپی تلی خصوصیت (Exactness) کو انھوں نے اکثر نظر انداز کر دیا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ حسرت کی طرح اختر کے کلام میں بھی روانی، سادگی و حلاوت پائی جاتی ہے، لیکن فارسی تراکیب کا استعمال انھوں نے زیادہ تر ضرورتِ شعری کی بنا پر کیا ہے، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ادنیٰ تامل سے اس نقص کو دور کر سکتے تھے ۔ فارسی تراکیب سے اس میں شک نہیں کہ صرف عذوبت و لطافت بلکہ وسعتِ مفہوم بھی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن یہ صرف اسی وقت گوارا ہو سکتی ہیں جب ان کا استعمال برمحل

کیا جائے، ورنہ وہ میکانکی چیز ہوکر رہ جاتی ہے اور مفہوم و مدعا سے منطبق کرنے کے لئے خدا جانے کیا کیا تاویلیں کرنا پڑتی ہیں۔

علیم اختر فکر و خیال کے لحاظ سے بڑے ستھرے ذوق کے غزل گو شاعر ہیں، لیکن کہیں کہیں ان کا انداز بیان صحیح راستہ سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے اور ہم اپنے لطف میں کچھ کمی سی محسوس کرنے لگتے ہیں۔

جا بجا ان کے بیان میں اُلجھن بھی نظر آتی ہے اور کہیں کہیں الفاظ و محاورات کا نامناسب استعمال بھی۔

مثالاً ان کی پہلی غزل کو لیجئے اس کا ایک شعر ہے :-

ترے کوچہ میں ہونا، اس پہ تیرا آستاں ہونا
مبارک تیرے کوچہ کی زمیں کو آسماں ہونا

شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ تیرے کوچہ کی زمین، آسمان کی ہم رتبہ ہے کیونکہ وہ تیرا کوچہ بھی ہے اور وہیں تیرا آستاں بھی ہے لیکن اس مفہوم کو وہ ظاہر نہ کر سکا۔ پہلے مصرعہ میں کوچہ کا استعمال غیر ضروری تھا، علاوہ اس کے کوچہ میں کہنا غلط ہے۔ ترے کوچہ میں ہونا کی جگہ ترا کوچہ ہونا کہنا چاہئے تھا "کوچہ کی زمین کا کوچہ میں ہونا" کوئی معنی نہیں رکھتا۔ پہلے مصرع میں کوچہ کی جگہ ان کو رہگزر کا ذکر کرنا چاہئے تھا۔ اسی زمین کا ایک اور شعر ہے :-

مجھے آنکھیں دکھائے گی بھلا کیا گردشِ دوراں
مری نظروں نے دیکھا ہے تو انا مہرباں ہونا

بہ ظاہر شعر بے عیب ہے لیکن ایک محاورہ کے نامناسب استعمال اور ایک غیر ضروری لفظ نے معیار تغزل سے اس شعر کو گرا دیا۔ "گردشِ دوراں" کا "آنکھیں دکھانا" محاورہ کا اچھا استعمال نہیں۔ اگر کہا جائے کہ اس محاورہ کا استعمال مصرع ثانی میں "نظروں" کے لحاظ سے کیا گیا ہے تو یہ عذر اور زیادہ کمزور ہوگا کیونکہ دوسرے مصرع میں خود "نظروں" کا استعمال ہی کب درست تھا۔ "میں نے دیکھا ہے" کی جگہ "میری نظروں نے دیکھا ہے" نہ اچھی زبان ہے نہ اچھا انداز بیان۔

ایک اور شعر اسی غزل کا ہے :-

جبین و آستاں کے درمیاں سجدے ہوں کیوں حایل
جبیں کو ہو میسر کاش جذبِ آستاں ہونا

سجدہ جبین کی ایک مخصوص حرکت کا نام ہے اور آستان و جبین کے درمیان وہ ایک واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعر اس واسطہ کو دور کرنے کا متمنی ہے اور چاہتا ہے کہ کاش جبیں جذبِ آستاں ہو جاتی۔ لیکن اس ترکیب سے سجدہ کا واسطہ کیونکر دور ہو سکتا ہے، کیونکہ اسی کیفیتِ جذب کا نام سجدہ ہے، اگر بجائے "جذبِ آستاں" کے وہ "جزوِ آستان" کہتے تو بیشک سجدہ کا واسطہ ختم ہو سکتا تھا، لیکن پھر بھی مضمون کی پامالی وہی رہتی۔

ایک اور غزل ہے :- "درمانِ محبت، سامانِ محبت"۔ اس کا ایک شعر ہے :-

پلکوں کو نہ دو جنبشِ پیہم کی اجازت
چھیڑو نہ ابھی سازِ رگِ جانِ محبت

"سازِ رگِ جاں" بے معنی ترکیب ہے۔ "رگِ جاں" کو ساز کا تار تو کہہ سکتے ہیں لیکن ساز نہیں کہہ سکتے۔ علاوہ اس کے یوں بھی "رگِ جاں" کی نسبت محبت سے درست نہیں۔ "محبت" کو علیحدہ جان تصور کر کے اس کی رگ کا ذکر کرنا بے معنی سی بات ہے، آپ محبوب کو "جانِ محبت" تو کہہ سکتے ہیں، لیکن خود اپنی محبت کو جان قرار دے کر اس کے رگ و ریشے کا ذکر نہیں کر سکتے۔

دوسرا شعر ہے :- دامن پہ ابھی تک ہیں گریباں کی بوندیں منجملۂ اجزائے پریشانِ محبت

پہلے مصرع میں ابھی تک کے بعد تجھی کا استعمال بالکل حشو ہے۔

ایک اور شعر:- وہ نیچی نگاہوں سے برستی ہوئی شبنم
اللہ رے وہ زودِ پشیمانِ محبت

شبنم کا استعمال اس وقت صحیح ہو سکتا تھا جب شعر میں لفظی یا معنوی مناسبت بھی پیدا کی جاتی اور وہ ہے نہیں، اس لئے صاف صاف یوں کہنا چاہئے تھا:- "وہ نیچی نگاہوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو"

دوسرے مصرع میں محبوب کو "زودِ پشیمانِ محبت" کہا گیا ہے، یعنی محبت کر کے جلد پشیمان ہو جانے والا - لیکن پشیمانی سے رونے کا کیا تعلق - ہاں اگر یہ کہا جاتا کہ وہ اپنی جفا پر پشیمان ہے تو البتہ درست ہو سکتا تھا - پھر بھی لفظ زود بیکار تھا۔

ایک اور غزل کا مصرعہ ہے:-

یہ کیا کہ تجھ کو تجھ ہی سے پوچھتا ہوں میں

تجھ ہی سے غلط ہے - تجھی سے نظم کرنا چاہئے۔

ایک اور شعر اسی غزل کا یہ ہے:-

آلِ کار گلستاں سے بے خبر ہو کر،
پھر آج ایک نشیمن بنا رہا ہوں میں

آلِ کار یہاں غلط استعمال ہوا ہے، گلستاں کا تعلق کار سے نہیں بلکہ حال یا انجام سے ہے - دوسرے مصرعہ میں ایک زاید ہے۔

ہائے کیا چیز ہے محبت بھی
آپ ہی لفظ آپ ہی مفہوم

دوسرا مصرع بے معنی ہے - لفظ اور مفہوم میں کوئی تضاد ہوتا تو یہ مصرعہ درست ہو سکتا تھا اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو پھر مصرعۂ اول میں چیز کا استعمال نامانوس ہے۔

جمالِ خراب عشق پر حسن جو مسکرا دیا
نغمے کھنک کے رہ گئے ٹوٹے ہوئے ستار میں

دوسرا مصرعہ بے معنی ہے - نغمہ میں کھنک نہیں ہوتی، کھنک مخصوص ہے ان سازوں یا مادی اشیاء کے لئے جن سے بعد ضرب کوئی آواز پیدا ہو سکتی ہے - جیسے طبلہ کی کھنک، روپیہ یا اشرفی کی کھنک - "ٹوٹے ہوئے ستار" سے کیا مراد ہے - اگر پہلا مصرعہ میں "جمالِ خراب عشق" کی جگہ "جمالِ دلِ خراب" لکھتے تو بے شک دل کو ٹوٹا ہوا ستار کہہ سکتے تھے۔

کھیل گیا ہے جان پر کون بھری بہار میں

"بھری بہار" خلافِ محاورہ ہے — "بھری برسات" پر قیاس کر کے "بھری بہار" کہنا صحیح نہیں۔

اخترِ غم نصیب، کیوں آہ لبوں تک آ گئی
یہ بھی تو ایک راز تھا سینۂ رازدار میں

یہ ہی (بروزن فعلن) نہیں بلکہ یہی (بروزن فَعَل) نظم کرنا چاہئے تھا۔ علاوہ اس کے رازدار کا استعمال محل نظر ہے۔ "سینۂ رازدار" یہاں ترکیب اضافی نہیں ہے جس سے مراد کسی دوسرے کا سینہ ہو، بلکہ ترکیب توصیفی ہے اور مراد خود اپنی ذات ہے، اس لئے بجائے سینہ کے دل کہنا چاہئے تھا۔

دل کو شایستۂ احساسِ تمنا نہ کریں آپ اس اندازِ نظر سے مجھے دیکھا نہ کریں

اپنے لئے "احساسِ تمنا" کہنا عجیب سی بات ہے، انسان کے دل میں تمنا پیدا ہوتی ہے نہ کہ احساسِ تمنا ہمارے اندر تمنا کا احساس دوسرا شخص کرتا ہے نہ کہ ہم۔ دوسرے مصرع میں نظر کا لفظ بیکار ہے۔ صرف انداز کہہ دینے سے مفہوم پورا ہو جاتا ہے اور زیادہ حسن کے ساتھ۔

گلۂ شوق، شکایاتِ جفا، شکوۂ جور لبِ خاموش جو گویا ہوں تو کیا کیا نہ کریں

جفا اور جور میں کوئی فرق نہیں، اس لئے "شکایاتِ جفا" کے بعد "شکوۂ جور" کہنا ایک ہی بات کی ناگوار تکرار ہے۔ حسرت موہانی کا ایک شعر ہے:

قصۂ شوق کہوں، درد کا افسانہ کہوں
دل ہو قابو میں تو اس شوخ سے کیا کیا نہ کہوں

اختر صاحب نے غالباً اسی سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا ہے، لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے، دوسرا نقص یہ ہے کہ کیا کیا نہ کریں کا فاعل "لبِ خاموش" ہے اس لئے "کیا کیا نہ کریں" کی جگہ "کیا کیا نہ کہیں" کہنے کا موقع تھا۔ اور اگر اس کا فاعل خود شاعر ہے تو لفظ ہم کا اظہار ضروری تھا

سرِ منزل پہونچنا باعثِ آرام جاں ہوگا مگر یہ لطفِ احساسِ غمِ دوری کہاں ہوگا

دوسرے مصرع میں لفظ احساس محض وزن پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے "لطفِ غمِ دوری" تو خیر ٹھیک ہے لیکن یہ "احساسِ غمِ دوری" اور اس کا لطف کیا؟

جمتی نہیں کسی چیز پہ کبھی اب اک خیرگی تابِ نظر دے گئے مجھے

دوسرے مصرع میں لفظ تاب بیکار ہے۔ "خیرگیِ نظر" کہنا کافی تھا۔ علاوہ اس کے نگاہ کی خیرگی میں یہ نہیں ہوتا کہ کسی چیز پر نگاہ نہ جمے بلکہ نگاہ کام ہی نہیں کرتی اور ہم کسی چیز کو دیکھ ہی نہیں سکتے، خیرہ، حیران کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس مفہوم کے لحاظ سے پہلا مصرع اور زیادہ غلط ہے کیونکہ حیرانی کے عالم میں تو نگاہ ایک جگہ جمکر رہ جاتی ہے نہ یہ کہ وہ کسی چیز پر نہ جمے۔

عرضِ حدیثِ شوق پہ شرما کے رہ گئے

لفظ حدیث بھی برائے بیت استعمال کیا گیا ہے۔ صرف "عرضِ شوق" کہنا کافی تھا۔

کہ اب تک حسن کے جلووں سے رعنائی نہیں جاتی

سے کی جگہ کی ہونا چاہئے۔

یہ سوچتا ہوں تری سادگی پہ کیا گزرے جسے قیام نہیں اس خوشی پہ کیا گزرے

پورا شعر بے معنی ہے۔ دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ ایک مفہوم ضرور رکھتے ہیں، لیکن دونوں میں باہم کوئی ربط و تعلق نہیں۔
جناب علیم اختر کے مجموعۂ کلام میں اس قسم کی لغزشیں بہ کثرت پائی جاتی ہیں جو نہ ہوتیں تو اچھا تھا۔

گاہے گاہے باز خواں ——!

خُدا ہے یا نہیں ؟

اس کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے چاہو، چاند کے ایاب و ذہاب سے پوچھو، آبشاروں کی روانی اور دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔

موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا ظہور و خفاء نباتات کی بوقلمونی، وحوش و طیور کی طبیعی نیرنگی، نوع انسانی کے توائے کامنہ، فضائے بسیط کے ستارے، کائنات کی لاانتہا وسعت، خور و شبنم، ذرہ و آفتاب اور ان سے بھی فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں، (جن کا نام ہم نے علم طبقات الارض، علم الجو، علم الافلاک، علم الکیمیاء، علم وظائف الاعضا، علم الحیات، نفسیات وغیرہ رکھا) بتائیں گی کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں اور اسی لئے یہ مسئلہ اسقدر بدیہی، اس درجہ روشن و واضح ہے کہ اگر چاہوں تو اسے مشاہدہ سے تعبیر کر سکتا ہوں جس کے لئے نہ کسی دلیل و برہان کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی حجت و توجیہ کی۔

آفتاب طلوع ہوتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس سے آگاہ ہو جاتا ہے، صبح کو پھول کھلتے ہیں اور سارا کنج نکہت سے معمور ہو جاتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جو آپ اپنی برہان ہے، یہ وہ صداقت ہے جو آپ اپنی مصدق ہے، اگر ہم اس سے ناواقف ہیں تو کس کا قصور!

حق خامش ست و با تو بصد رنگ گفتگوست — شوق آرمیدہ است و فلک تاز جستجو است
موقوف اضطراب زماں نیست عرض راز — گرد ارسی اشارۂ تحقیق مو بمو ست
ہر گہ نظر خطاب کند حرف خامشی ست — ہر جا بہار ساز شود نغمہ رنگ و بوست
کثرت حجاب جلوۂ وحدت نمی شود — مژگاں بہم چہ باز کنی دیدہ محوِ اوست

پھر اب اور نہ کبھی، یہ سوال تو پیدا ہی نہیں ہوا کہ کوئی قوت مافوق الادراک ہے یا نہیں البتہ عقول انسانی کا اختلاف اس امر میں ضرور ہوا ہے کہ ہم اس کا تصور کیونکر کریں، اس نہ دیکھے جا سکنے والے کو کیونکر دیکھیں اور اس نہ سمجھے جا سکنے والے کو کس طرح سمجھیں۔ فلسفہ آج تک اس گرہ کو نہ کھول سکا، مذہب کی عقدہ کشائیاں تمامتر اسی ایک معمہ سے وابستہ رہیں اور مختلف زمانوں میں، مختلف انبیاء و رسل نے مختلف طریقوں سے اسی مسئلہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا لیکن کیا یہ امر حیرتناک نہیں کہ باوجود اس کے کہ حقیقت ایک ہے مگر تعبیرات بے شمار، راز ایک ہے مگر اس کی داستانیں کثیر!

"حُسنک واحد و عبارا تنا شتّے"

جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ — چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

مذاہب و نسک اور اقوام و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کفر و اسلام، اذان و ناقوس کی جنگ جو آج نظر آ رہی ہے، کوئی نئی چیز نہیں بلکہ اس کی ابتدا اسی وقت سے ہوتی ہے جب سے انسان اپنی فطرت کے جذبۂ تفوق پرستی لے کر آیا ہے۔ یقیناً یہ جنگ علم و مذہب کی جنگ نہیں، کیونکہ اگر مذہب کا مقصود اعلیٰ صرف خدا شناسی ہے تو پھر مجھے کوئی سمجھائے کہ دنیا کا کون سا علم ہے جو معناً اس غایت تک نہیں پہونچتا، نہیں، بلکہ یہ جنگ ان رقیبوں کی تھی جو ایک ہی محبوب کے جلوہ کے لئے بیتاب تھے، ان جانداوگان

خود فراموش کی تھی جو سوا اپنے کسی اور کو "خلوتیانِ راز" میں شامل دیکھنا پسند نہ کرتے تھے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں یوں کہیے کہ وہ اپنے ہی "ذوقِ سجود" کا تفوق ثابت کرکے آستانِ "محبوب" کو اپنے لئے مخصوص کرلینا چاہتے تھے یقیناً یہ کمزوری کم و بیش ہر زمانہ کے انسان میں پائی گئی ہے اور آج بھی تمام افتراق و انشقاق اسی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

فلسفہ و استدلال کی دنیا میں آکر جس وقت اس مسئلہ پر غور کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ اس کا اصل سبب صرف یہ ہے کہ خدا کے جس تصور کو مذاہبِ عالم نے پیش کیا وہ صحیح نہ تھا۔ ممکن ہے کہ صرف قومی و ملکی نظامِ تمدن کے لحاظ سے اس وقت مناسب رہا ہو، لیکن اخوتِ عامہ اور ہمہ گیری کے لحاظ سے وہ نامکمل تھا۔ دُنیا میں صرف ایک ہی مذہب ایسا ہوا ہے جس نے ہزاروں لاکھوں سال کی اس گتھی کو سلجھایا اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اب نہ مذہب کے لحاظ سے کسی اور مذہب کی ضرورت دُنیا کو باقی ہے نہ مبلغ مذہب کی حیثیت سے کسی اور ہستی کے رونما ہونے کی حاجت — اور وہ مذہب اسلام ہے جو نہ کسی ملک کے لئے مخصوص ہے نہ کسی قوم کے لئے مختص، اس کی دعوت گبر و ترسا، یہود و نصاریٰ، عالم و جاہل، امیر و فقیر، شاہ و گدا، مشرق و مغرب، شمال و جنوب، ہر طبقہ و ہر ملک کے لئے یکساں ہے اور اسی لئے اس نے جو مفہوم خدا کی کبریائی کا پیش کیا ہے وہ ایسا جامع، ایسا قرینِ عقل، ایسا ہمہ گیر اور اس درجہ وسیع ہے کہ جس آسانی سے ایک جاہل اسے قبول کرسکتا ہے بالکل اسی طرح ایک فلسفی بھی اس کے ماننے پر مجبور ہے۔

وہ زمانہ جب "آسمانی بادشاہت" کا وعظ کہکر خدا کو ایک دنیاوی صاحبِ جبروت بادشاہ کی طرح پیش کیا جاتا تھا، ختم ہوگیا وہ عہد جب عقولِ انسانی صرف مرئی و محسوس اشیاء پر ایمان لاسکتے تھے اور جب ضرورتاً و مصلحتاً مسیح کو خدا کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت ہوئی تھی، گزر گیا، وہ دورِ انسانیت جب مرکزِ نفس (concentration of mind) کے لئے رمزی اور اشاری Symbolic طریقِ عبادت محسوس کرکے خدا کے وجود کو بتوں، ہیکلوں، تمثالوں اور مجسموں میں تبدیل کیا گیا باقی نہیں ہے، یہ تمام زمانے تقریباً ۱۳۵۰ سال قبل ختم ہوگئے — ریگستانِ عرب سے ایک انسان کامل و اکمل کا ظہور ہوا اور اس نے نہایت ہی مختصر و سادہ الفاظ میں خدا کے وجود کا وہ فلسفہ بیان کیا جو اس سے قبل کسی نے بیان نہ کیا تھا۔ اس نے ثنویت و تثلیث کی تردید کی، اس نے تجسیم و تشکیل کو غلط ٹھہرایا، اس نے تشتت و انتشار کی صورتوں کو محو کیا، تفریق و افتراق کی راہوں کو بند کیا اور اس نے بتایا کہ خدا تمام مکانیات و زمانیات کے تعلق سے بے نیاز ہے، مادیات کی دُنیا سے علیحدہ ہے اور تمام ان نسبتوں و اضافتوں سے منزہ جو عقولِ انسانی کو کسی وجوہ کے سمجھانے کے لئے متعین کی جاتی ہیں۔

ایک طرف تو اس نے بتایا کہ اس کا قیام عرشِ بریں پر ہے، یعنی ذاتِ انسانی سے علیحدہ [illegible] میں فضائے وسیع اور جولانگاہِ بے تناہی میں ہے جو کچھ ہے وہ سب اسی کا ہے اور اسی کا پیدا کیا ہوا ہے اور دوسری طرف اس کو شہ رگ سے [illegible] قریب بتایا یعنی جس حد تک ذاتِ انسانی کا تعلق ہے، اس کے قرب کی کوئی انتہا نہیں، وہ نفس میں جاری ہے، خون میں ساری ہے، روح میں دوڑ رہا ہے، قلب میں جاگزیں ہے۔ اس کو رحمان و رحیم بتایا، اور جبار و قہار ظاہر کیا۔ بظاہر یہ نام ایک دوسرے کی ضد ہیں، لیکن یہیں سے یہ عقدہ حل ہوتا ہے کہ جن کو اسمائے حسنیٰ کہا جاتا ہے وہ نہ خدا کے ذاتی نام ہیں نہ صفاتی، بلکہ آثاری و ظاہری اسماء ہیں جن کا تعلق کائنات کے ہر تغیر و تبدل، زندگی کے تمام اصول اور ہستی کے جملہ اعتبارات و امتیازات سے ہے۔ یعنی اگر انسان خوش و پرامن زندگی بسر کر رہا ہے تو یہ بھی اسی کا مظہر ہے اور اگر قہر و جبر کی ساعتیں گزار رہا ہے تو یہ بھی اسی ایک ذات کی وجہ سے ہے جس نے اسباب و علل پیدا کرکے عالم کی تمام کیفیات مادی و مذہبی کو اپنے سے منسوب کیا ہے اور جن کے اختیار کرنے اور انھیں کے مطابق نتائج حاصل کرنے کے لئے انسان کو عقلِ کامل عطا فرمائی ہے

یہ تھا خدا کا وہ تصور جو بانیِ اسلام نے بتایا اور دعوے کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزہ و منزہ خیال جو بالغ ترین نگاہ اور رسا ترین فکرِ انسانی کے لئے بھی قابلِ قبول ہو اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ یہی ہے وہ اصل اصول مذہب جو انسان

کو وسیع النظر بناتا ہے جو تمام افراد کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کرتا ہے اور جو دلوں کو تعصب و جہل، کینہ و بغض سے پاک کرتا ہے لیکن کیا کوئی مسلمان آج کہہ سکتا ہے کہ وہ خدا کو ایسا ہی سمجھ رہا ہے، جیسا بانی اسلام نے سمجھایا تھا اور اس کی آغوش ہر انسان کے لئے خواہ وہ کسی مذہب و ملت کسی ملک و قوم کا ہو پوری طرح کھلی ہوئی ہے، یہاں تک کہ طبقۂ صوفیہ بھی جو کے مشرب و مسلک کا انحصار ہی عقیدۂ "وحدت وجود" پر ہے کوئی کیفیت اپنے ذہن و ضمیر میں اس نوع کی نہیں پاتے جو اس اعتقاد کے بعد پیدا ہونی چاہئے

ہمارے ہاں کے علماء مقدس جو اپنی ساری زندگی صرف روزہ و نماز کی تلقین میں بسر کر دیتے ہیں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی غور نہیں کرتے کہ جس خدا کا پیام وہ دنیا کو پہونچا رہے ہیں وہ پہلے روزہ و نماز کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ اس تعلق کی تصدیق چاہتا ہے جو اس کے اور بندوں کے درمیان قایم ہے اور جس سمجھنے پر کائنات کی ترقی، روح کا استعلاء، اخلاق کی پاکیزگی، مادی ارتقاء اور عالم کا امن و سکون منحصر ہے، اگر ایک مسلمان نماز پڑھنے کے بعد مسجد سے یہ خیال لے کر نکلتا ہے کہ مندر و کلیسا خدا کی حکومت سے علٰحدہ ہیں، اگر وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھ کر اپنے سوا تمام عالم کو غیر خدا کی مخلوق جانتا ہے تو مذہب معلوم و اہلِ مذہب معلوم !

پھر جب خدا سب کا ہے تمام مخلوق اسی کی ہے، اس کو نہ مذہب سے فایدہ پہونچتا ہے نہ لامذہبیت سے نقصان تو پھر عصبیت کیوں، یہ تفوق و برتری کا غلط معیار کیا، طریق عبادت کے اختلاف پر جنگ کیا معنی، وضع و لباس کی تفریق، تمدن و معاشرت کے امتیازات پر آویزش کیسی ؟

دل چو آزاد از تعلق شد منور می شود — قطرۂ کز موج دامن چید گوہر می شود
ہیچکس را در محبت شرم ہم چشمی مباد — در ہوایت ہر کہ گریدہ امتری شود

"انسانیت" اب نہیں بلکہ طفولیت ہی سے حسن و جمال کا خواب دیکھ رہی ہے اور جس حد تک اس کا علم اور اس کے مشاعر بڑھتے جاتے ہیں، اسی قدر زیادہ شدت و تنوع کے ساتھ یہ کیفیت بڑھتی جاتی ہے، چنانچہ ایک صاحبِ فن اپنے فن میں، ایک شاعر اپنے شعر میں، ایک ادیب اپنی انشا میں، ایک فیلسوف اپنے فلسفہ میں، یہاں تک کہ ایک مادہ پرست بھی (جو اپنی فطرت کے لحاظ سے حسن کے مفہوم سمجھنے کا بہت زیادہ نا اہل ہے) حسن ہی کا خواب دیکھتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ جمال کسے کہتے ہیں ؟

جمال ایک خیال ہے جو مادہ کے ملبوس میں جلوہ گر ہوتا ہے وہ ایک تبسم ہے جو عالمِ انسانیت کی پیشانی پر نمودار ہوتا ہے وہ صحراء حیات میں تھک جانے والے تمدن کی جائے پناہ ہے۔ وہ ایک قوت ہے جو مادہ کی قیود سے ہمیں آزاد کرتی ہے وہ حیات سے زیادہ ترقی یافتہ چیز ہے جو حیات کو بھی بھلا دیتی ہے۔ ماں اپنی لڑکی کے سنہرے بالوں کے چھلوں کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے مسکرا پڑتی ہے اور لڑکی ہنس دیتی ہے، شاعر دیکھتا ہے اور ان دونوں کی ہنسی میں جمال الٰہی کی چمک محسوس کرتا ہے۔ ایک نوجوان اپنی محبوبہ کے چہرہ پر نگاہ ڈال کر اپنے قلب کو سکون سے بھر لیتا ہے، ایک شخص شام کے وقت آسمان کی رنگین فضا کو دیکھ کر، آفتاب کو افق لاہایت میں غروب ہوتے ہوئے دیکھ کر جمال فطرت سے متاثر ہوتا ہے ایک شاعر مغنی حسن سے متاثر ہو کر، اپنی موسیقی کے باڑوں سے فضا میں اس تاثر کو پھیلا دیتا ہے، پھر اگر اس کا نغمہ عظمت وطن سے متعلق ہے تو وہ اپنے نفس کو وطن کے ہیکلِ مقدس پر قربان کرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اگر وہ نغمۂ محبت ہے تو ہر آواز کے ساتھ وہ اپنی روح کے اجزاء کو صرف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔

"تارڈ" (Tarde.) اپنی کتاب " المنطق الاجتماعی " (Logique Sociale) میں کہتا ہے " ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں جب وہ قوی ہوتا ہے ہم اسے عظیم کہتے ہیں جب اس کے افراد مہذب و شایستہ ہوتے ہیں، یقیناً جمیل ہے وہ وطن جو ظلم کے سامنے نہیں جھکتا اور جو لواء حضارت بلند کرنا اپنا نصب العین قرار دیتا ہے

اسپارٹا حسین تھا، جب اسپارٹا کا رہنے والا دیکھتا تھا کہ وہ بلاد یونان پر حکمراں تھا، جب اہل مصر اپنے ملک کی عظمت کے معتقد تھے اور وہاں کے ہیاکل و آثار میں وہ انوار ربانی کی روشنی کو مرکوز پاتے تھے۔ روما جمیل تھا۔ جب رومانی اپنی مملکت کو تمام بلادِ عالم کی ملکہ جانتا تھا۔ بلاد عرب جمیل تھا۔ جب اسلام اس کے فرزندوں کو حضارت مدنیت سے آراستہ کر رہا تھا اور اس کی شوکت و جبروت کی داستانیں دنیا کے ہر گوشہ میں سنی جاتی تھیں۔

یہ خیالات تھے ایک مصری ادیب کے جن میں رات میں محو تھا۔ میں نے سوچا کہ سرزمین ہند بھی جمیل تھی جب کرشن کی تعلیم نے صحیح معنی میں حریت و آزادی کی روح گوشہ گوشہ میں پھونک رکھی تھی۔ لیکن اب وہی سرزمین مشرق جو ہمیشہ سے طلوع حق و صداقت اور ظہور تہذیب و مدنیت کے لئے مشہور تھی، سوگوار ہے کیونکہ اس کا جمال محو ہو گیا ہے۔ اس کی عظمت مٹ چکی ہے اور غالباً اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ یہ تمام سوگواریاں خود فرزندانِ ملک کے ہاتھوں اس کو حاصل ہوئی ہیں۔ کیا ہندوستان کی تاریخ غلامی سوا اس بدبختی کے کسی اور چیز کی تاریخ تھی کیا فرزندانِ آریہ ورت کہہ سکتے ہیں کہ ان میں وہی غیرت و حمیت، وہی بلند خیالی و عالی نظری پائی جاتی ہے جو ان کے اکابر و اعاظم میں پائی جاتی تھی۔ آج ہندوستان کی آبادی کا عنصر غالب غیر کی حکومت سے آزاد ہو چکا ہے ..... لیکن کبھی اس نے اس پر بھی غور کیا کہ وہ خود اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ کس سلوک و رواداری کو جائز رکھتا ہے۔ ہندوستان کے لئے آزادی اس کا فطری حق تھا جو اس نے حاصل کر لیا ..... لیکن وہ کبھی ایک لمحہ کے لئے ملک کی اس آبادی کے جذبات کا خیال نہیں کرتے جس کے ضعیف شانوں کی مدد حاصل کئے بغیر یہ بار آسانی سے نہیں اٹھ سکتا۔

مطبوعات جامعہ عثمانیہ

ریاض، سائنس، فلسفہ، تاریخ، معاشیات، عمرانیات، نفسیات، انجینئرنگ، طب و جراحی اور دیگر فنون کی نادر مطبوعات جس کے تراجم جامعہ عثمانیہ سے شایع ہو چکے تھے اور جن کو سارے ادبی حلقوں میں غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل ہو چکی ہے، اب قیمتوں میں بغیر کسی اضافہ کے صرف ہم ہی سے مل سکتے ہیں۔

نوٹ :۔ فہرست مفت بھیجی جائے گی۔

پروپرائٹر :۔ کتب خانہ حیدری چھتہ بازار

حیدر آباد دکن

پاکستان والے حسب ذیل پتہ سے فہرست اور کتابیں طلب کریں :۔

بک ہنیڈ ۱۲ محمد بلڈنگ ۔ ہر مزجی اسٹریٹ بندر روڈ۔ کراچی

فون نمبر ۳۶۱۰۹

گلہائے پریشاں

آراستہ الیاس احمد (ریٹائرڈ سسٹرکٹ جج)

ضخامت کتاب ۵۰۸ صفحات۔ تقطیع بڑی۔ قیمت، روپیہ ۸ آنے

ملنے کا پتہ :۔ کتابستان۔ الہ آباد

"گلہائے پریشاں" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام کا بے مثل گلدستہ ہے۔ آغاز عشق سے انجام عشق تک جتنے مراحل پیش آتے ہیں، اُن کے متعلق سُرخیاں قایم کی گئی ہیں اور چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار ہر سُرخی کے تحت میں تقدم اور تاخر کے لحاظ سے درج ہیں۔ مراحل محبت کی سُرخیوں کے علاوہ خمریات، مذہبیات، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بھی سرخیاں قایم کی گئی ہیں۔ سُرخیاں سیکڑوں ہیں۔ اگر کسی شعر کے متعلق کوئی لطیفہ ہے درج ہے۔ اساتذہ سابق کی تیس تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں۔ اُردو ادب میں یہ کتاب ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت اثرؔ لکھنوی :-

تیری جانب کس طرح دیکھے وہ ایدل بھر نظر
آئنے میں عکس سے اپنے جو شرما جائے ہے

پھر کسی تازہ جفا کی رکھنے والا ہے بنا
کھوئے کھوئے اُسکے رہنے سے یہ پایا جائے ہے

یہ نہ اظہار تمنا ہے نہ عرض ماجرا
میں تڑپتا ہوں تڑپنے دے ترا کیا جائے ہے

دل کو آئینہ بنا تمثال حسن دوست کا
یوں ہیں دیکھا جائے ہے خود بیں جو دیکھا جائے ہے

پھر قرار آئے کسی صورت یہ ممکن ہی نہیں
وہ جسے تسکین کے پردے میں تڑپایا جائے ہے

آل احمد سرورؔ :-

گرچہ خارِ دشت دامن سے اُلجھتا جائے ہے
کچھ چمن بندی کے ارماں پر تو رنگ آجائے ہے

ہر قدم پر خود ہی دیتی ہے بڑھا وا چشم دوست
عاشقی کا بار کب تنہا اُٹھایا جائے ہے

اس کی قامت پر ابھی موزوں نہیں ہے یہ لباس
آدمی گو عقل کے سانچے میں ڈھلتا جائے ہے

فکر کی جنت، نظر کے پھول، داغوں کی بہار
اُن کے قدموں میں یہ سرمایہ لٹایا جائے ہے

جام دنیا سے ہو کم کیا بیدلی عشاق کی
اعتبارِ چشم ساقی جبکہ اُٹھتا جائے ہے

رہکے دُنیا میں کہاں تک پارسائی ہو سرورؔ
میکدے میں کیا کبھی کوئی فرشتا جائے ہے

زندگی

فضا ابن فیضی :-

رنج کی صبح، اضطراب کی شام
زخم کے پھول، آنسوؤں کے کنول
ہر مداوا ہے درد سے معمور
ہر نظر، حزن و یاس کی تفسیر
ہر نشہ ہے خمار کا پابند
زخم اور زخمِ ناشکیبائی
لطفِ شام و پگاہ سے ہوں خجل
پیشتر دل میں ہیں کئی پیوست
ہوں ہلاک شکستگی یارب !
تیری رحمت سے ہے مجھے یہ گلا
دل کو شعلے ملے تو آنکھ کو نم
موت سونپی گئی ہے کہہ کے حیات
آہ ! اے ذوالجلال والاکرام
گل نچھاور کئے شرر پارے
مسکراہٹ بکھیری، زخم چنے،
ہم نے جب بھی کئے ہیں جھک کے سلام
صبح قربان کی تو رات ملی،
کی وفا، جور کا نشانہ بنے،
ہم نے دی جب نویدِ فصلِ بہار
ہم نے جب آفتاب نذر کئے
یہ شکایت نہیں بغیر سبب
بو گئے تریاق، زہر کاٹا ہے
زندگی کتنا سخت گھاٹا ہے

درد کے گیت، حسرتوں کے پیام
دیکھ یہ زندگی کا رنگِ محل،
ہر مسرت میں غم کے ہیں ناسور
ہر نفس ہے خلش کی اک زنجیر
آنسوؤں کا لہو سے ہے پیوند
آنکھ ضبطِ الم کی سہہ آئی،
کھے رہا ہوں لہو میں کشتیِ دل
کون کافر ہے اپنے حال میں مست
ایک تہمت ہے زندگی یارب !
عیشِ ہستی بقدرِ غم نہ ملا
یوں بھی برسا ہے تیرا ابرِ کرم
چھین کر صبح دی گئی ہے رات
کیا یہی زندگی کا ہے انعام
روشنی نذر کی ملے سائے
ہم نے بدلے دعا کے طنز سنے
آئے ہیں سرد مہریوں کے پیام
دل دیا غم کی کائنات ملی،
کی بھلائی، برائیوں میں تلے
ہم کو بخشے گئے نکیلے خار،
چند ٹوٹے ہوئے ستارے ملے
ہم نے تیری زمین میں یارب !

مہر اکبر آبادی (راولپنڈی) :-

اُن کے ستم کی کچھ تو مکافات ہو گئی
باوصفِ احتیاطِ نظر بات ہو گئی

اُن کی نظر تبسّمِ پنہاں لئے اُٹھی
یوں بھی کبھی تو پرسشِ حالات ہو گئی

خود اپنی بے رُخی پہ وہ افسردہ ہو گئے
میں جس سے ڈر رہا تھا وہی بات ہو گئی

یہ اور بات ہے کہ قیامت گزر گئی
لیکن ترے بغیر بسر رات ہو گئی

یہ انتہا ہے کہ آہٹ گلوں کو بھی نہ ملی
کچھ ایسے چپکے سے اب کے بہار گزری ہے

مری نگاہ کا مفہوم تیرے ہونٹوں پر!
یہ بات سب کو بڑی ناگوار گزری ہے

یہ کن حدود میں وارفتگیِ دل لائی
تجھے بھی پا کے جہاں میں نے اِک کمی پائی

تری نگاہ کو اب رازدار کون کرے
کہ اِک جہاں سے مرے دل کی بات کہہ آئی

بڑا عجیب ہے یہ ماجرا مرے غم کا
کہ تیرے پاس بھی محسوس کی ہے تنہائی

مرے لئے تری رخصت کا داغ کافی تھا
یہ کیا غضب ہوا، کیوں تیری آنکھ بھر آئی

اُٹھا سکی نہ ترے بارِ غمگساری کو
جو زیست مرحلۂ غم سے بھی گزر آئی

اب اُن کی یاد بھی اے مہرؔ ہو گراں دل پر
نہ جانے زندگیِ غم مجھے کہاں لائی

بعد مدت کے مرے لب پہ تبسّم آیا
ہو نہ ہو دل نے کوئی زخم نیا پھر کھایا

اب غمِ دوست سے بھی کچھ نہیں ملتی تسکیں
مجھ کو آخر غمِ دوراں - یہ کہاں لے آیا

دل پہ کیا بیت گئی ہو گی یہ دل ہی جانے
گو تری بزم سے وہ مجھ کو اُٹھا تو لایا

آچلا تھا مجھے کچھ تیری وفاؤں کا یقیں
ہائے کب تیرے تبسّم نے مجھے چونکایا

شفقت کاظمی :-

باغ اپنا کچھ اس طرح اُجڑا — شکل دیکھی نہ پھر بہاروں کی
تیرے آوارہ گانِ شوق چلے — خیر ہو تیری رہگذاروں کی
ایک الزام ہوگئی ہم پر — زندگی ہم سے بے سہاروں کی
حضورِ دوست میں ہر چند لب نہ کھل پائے — مگر نظر سے انھیں حالِ دل سُنا آئے
وفائے عہد کا اُن کو خیال آ نہ سکا — ہم اُن سے ربطِ محبت بڑھا کے پچھتائے
نہ احترامِ تمنا تمھیں نہ قدرِ وفا — ترے دیار میں آئے تو کوئی کیا آئے
بڑا مزا ہے ترے انتظار میں لیکن — دلِ غریب نہ جی سے کہیں گزر جائے

"نگار" کے پچھلے فائل

(یہ تمام فائل اکٹھا فروخت ہوں گے)

سنہ ۲۶ء = ——— مئی تا اکتوبر ——— ۷ے
سنہ ۲۷ء = ——— جون تا نومبر ——— ۷ے
سنہ ۲۸ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵
سنہ ۲۹ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵
سنہ ۳۰ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵
سنہ ۳۱ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵
سنہ ۳۲ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵
سنہ ۳۳ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ے
سنہ ۳۴ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵
سنہ ۳۵ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵
سنہ ۳۶ء = ——— جنوری تا دسمبر ——— ۱۲ع۵
سنہ ۳۷ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ے
سنہ ۳۸ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ے
سنہ ۴۵ء = ——— جولائی تا اکتوبر ——— ۴للعہ
سنہ ۴۶ء = ——— جنوری تا نومبر ——— ۱۱ع۵
سنہ ۴۸ء = ——— جنوری تا جون ——— ۷ے
سنہ ۳۳ء = ——— جولائی، اگست، ستمبر، نومبر، دسمبر ——— ۵

نیجر نگار لکھنؤ

رعایتی اعلان

من و یزداں ——— مذہبی استفسارات و جوابات ——— نگارستان۔
۸ جہ — للعہ — جہ
جمالستان ——— مکتوبات نیاز تین حصے ——— مذہب
۵ جہ — ع۱۲ — عہ
انتقادیات ——— مالہ وماعلیہ ——— حسن کی عیاریاں —
للعہ — ۲ — ۲
شہاب کی سرگزشت ——— مجموعۂ استفسار و جواب جلد سوم —
۲ — ۷ے
فلاسفۂ قدیم ——— فراست الید ——— نقاب اُٹھ جانے کے بعد —
عہ — عہ — ۸

میزان
۵۵ حصہ

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول
صرف پینتالیس ۴۵ روپے میں ملسکتی ہیں

نیجر نگار لکھنؤ

ارشد صدیقی :-

یوں تو کرنے کو سبھی کرتے ہیں پیمانے کی بات
ہے مگر میکش وہی رکھ لے جو میخانے کی بات

آگیا ہے ذکر ان کے زلف و عارض کا ضرور
چھڑ گئی ہے جب حرم والوں میں بتخانے کی بات

اپنا اپنا غم لئے بیٹھے ہیں سب اہلِ خرد
کون سنتا ہے تری محفل میں دیوانے کی بات

حاصلِ دیوانگی یہ ربط بھی کچھ کم نہیں
ہنس تو دیتے ہیں وہ سنکر اپنے دیوانے کی بات

یہ تو آپ اپنی بہارِ فتنہ زا سے پوچھئے
اہلِ گلشن کیوں کیا کرتے ہیں ویرانے کی بات

ہم تو ارشد کر رہے تھے حل معمّے زیست کے
چھیڑ دی کس نے یہ ان کی زلف سلجھانے کی بات

سرور بارہ بنکوی :-

راحتِ قلب و سکونِ جاں سمجھ بیٹھے تھے ہم،
اُن کو کیا کیا اے دلِ ناداں سمجھ بیٹھے تھے ہم

حُسن کی فطرت یہی ٹھہری تو پھر کیسا گلا ؟
اُس کے ہر پیماں کو کیوں پیماں سمجھ بیٹھے تھے ہم

جی رہے ہیں آج بھی یا اک وہ عالم تھا سرور
اُس کی رخصت کو وداعِ جاں سمجھ بیٹھے تھے ہم

ندیم جعفری :-

وہی شہر کی ہیں گلیاں وہی رہگذار لیکن
ترے بعد ہم نہ لوٹے ترے بعد ہم نہ آئے

بڑی داد دے گئے ہیں مری تلخ زندگی کو
ترے مختصر اشارے ترے مختصر کنائے

"نگار" کے پچھلے فایل

سنہ ۳۲ء	=	جولائی تا دسمبر	=	———	= ۸؍
سنہ ۳۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ہندی شاعری نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۳۷ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ اصحاب کہف و خلافت نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۳۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ مصحفی نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۴۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ نظیر نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۴۴ء	=	جولائی تا دسمبر	=	———	= ۸؍
سنہ ۴۶ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ انتقاد نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۴۷ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ ماجد و لین نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۴۹ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ افسانہ نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۵۰ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ تنقید نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۵۲ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ حسرت نمبر)	= ۱۵؍
سنہ ۵۳ء	=	جنوری تا دسمبر	=	(سالنامہ داغ نمبر)	= ۱۵؍

نوٹ :- صرف ایک ایک فایل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔ منیجر نگار لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

طنز و مزاح یہ تاریخ ادب اردو کے "طنز و مزاح" کی جسے غلام احمد صاحب فرقت نے دو جلدوں میں مرتب کیا ہے پہلی جلد نظم کے لئے مخصوص ہے اور دوسری نثر کے لئے۔

ہجو نگار شاعروں میں انھوں نے جعفر زٹلی، سودا، انشا اور مصحفی کا ذکر کیا ہے اور اسی سلسلہ میں دو ریختی گو شاعر رنگین اور جان صاحب کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس کے بعد نظیر اکبر آبادی، غالب اور اکبر الہ آبادی کا ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ اس سلسلہ میں غالب کا ذکر مناسب نہ تھا۔ پھر اودھ پنچ کے پہلے اور دوسرے دور کے شعراء کو لیا ہے اور اسی سلسلہ میں اقبال، جوش، شبلی، ظفر علی خاں، ظریف، نجم ناصر، شہباز، سید محمد جعفری، گنھیا لال کپور اور خود اپنا ذکر کیا ہے، حالانکہ اس سلسلہ میں بھی اقبال، جوش اور شبلی کا ذکر مناسب نہ تھا۔ جنھوں نے کبھی کبھی شاعری میں طنز سے ضرور کام لیا ہے لیکن یہ ان کا فن نہ تھا۔

حصۂ نثر کی فہرست زیادہ طویل ہے اور اس میں بھی بعض نام ہم کو ایسے نظر آتے ہیں جن کو ہم طنز نگار یا مزاح نگار نہیں کہہ سکتے۔ یونہ تو ہر ادیب کے یہاں کہیں نہ کہیں طنز و مزاح ضرور پایا جاتا ہے، لیکن ہم صحیح معنی میں اسی ادیب و شاعر کو مزاح نگار کہیں گے جس نے مزاح نگاری کو فن کی حیثیت سے اختیار کیا ہے۔

ہماری رائے میں ایسے ادیبوں یا شاعروں کو نہ لینا چاہئے تھا جنھوں نے کبھی کبھی تفنناً مزاح نگاری کی ہے یا یہ کہ ان کے کلام میں کہیں کہیں طنز و مزاح کا رنگ بھی پایا جاتا ہے اور اگر ایسا کیا جاتا تو شاید یہ کتاب اتنی ضخیم نہ ہوتی۔

اس کتاب کا اصل حصہ اس کا مقدمہ ہے جو تقریباً ڈھائی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور وہ اپنی جگہ اتنی مکمل چیز ہے کہ اس کے بعد اصل کتاب کے دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ ان دونوں جلدوں کی قیمت دس روپیہ ہے اور ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ نے اسے شایع کیا ہے۔

نکہتِ گل مجموعہ ہے جناب علیم اختر کی غزلوں اور نظموں کا۔ اختر صاحب، آلم مظفر نگری کے شاگرد ہیں اور سیماب مرحوم سے بھی کچھ دن استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان کی غزلوں میں حسرت موہانی کا رنگ زیادہ نمایاں ہے، جس کا اعتراف خود انھوں نے کیا ہے۔ فراق، جگر و فانی کی رائیں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں اور ان سب نے ان کے ذوقِ تغزل کو سراہا ہے۔

اختر صاحب کے کلام میں شگفتگی و سلاست، نرمی و حلاوت یقیناً پائی جاتی ہے اور بعض بعض شعر انھوں نے بڑے پاکیزہ کہے ہیں لیکن پختگی و استواری کی کمی ضرور ہے۔ ضرورت شعری کے لحاظ سے غیر ضروری الفاظ و تراکیب کا استعمال ان کے یہاں بھی پایا جاتا ہے جو نہ ہوتا تو بہتر تھا۔

علیم اختر صاحب فکر و خیال کے لحاظ سے یقیناً اچھے شاعر ہیں، لیکن اندازِ بیان کے لحاظ سے اب بھی ان کو کسی اچھے رہبر کی ضرورت ہے۔ اسی اشاعت میں ایک مختصر سا مضمون "نقاد" کا شایع ہو رہا ہے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ ان کے کلام میں جو نقایص پائے جاتے ہیں، ان کی نوعیت کیا ہے۔

مجموعہ بڑے اہتمام سے شایع کیا گیا ہے اور عالمی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے تین روپیہ میں مل سکتا ہے۔

آبلہ دل کا ناول ہے ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا جسے حال ہی میں اردو اکاڈیمی سندھ نے رحمت بلڈنگ بندر روڈ کراچی سے پاکیزہ طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے۔

ڈاکٹر فاروقی کے دو ناول "شام اودھ" اور "رہ و رسم آشنائی" اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں اور اپنے مخصوص لب و لہجہ کے لحاظ سے کافی مقبول ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر فاروقی کا نقطۂ نظر ناول نگاری میں اودھ اور خصوصیت کے ساتھ لکھنؤ کی پچھلی معاشرت و تہذیب کو پیش کرنا ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ وہ مرزا محمد ہادی رسوا سے اس قدر متاثر ہیں کہ ان کے ہر ناول میں کوئی نہ کوئی امراؤ جان ادا ضرور پائی جاتی ہے۔ وہ فطرتاً چونکہ بڑے خوشدل انسان ہیں، اس لئے ان کا کوئی ناول ظرافت و مزاح سے خالی نہیں، لیکن یہ ظرافت تقریباً انگریزی کے مشہور ظرافت نگار WOODEHOUSE کی سی ہے جسکو صرف ایک لفظ کا Forced Humour توضرور کہہ سکتے ہیں اور جو ذرا سی لغزش سے مسخرہ پن میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

فاروقی صاحب سرزمین لکھنؤ کے فرزند ہیں اور اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کو زباندان ہونا چاہئے، لیکن افسوس ہے کہ اکثر جگہ زباندانی کی صحیح خصوصیت سے ہٹ کر وہ ہمیں "زباں آور" نظر آتے ہیں اور اس سلسلہ میں جو غلطیاں زبان و بیان کی سرزد ہو سکتی ہیں ان سے ان کا کوئی ناول خالی نہیں۔

بہرحال ناول زیر بحث دلچسپ ضرور ہے، لیکن پلاٹ یا زبان کی حیثیت سے اس کو ہم کوئی معیاری چیز نہیں کہہ سکتے۔

ضخامت ۲۷۲ صفحات ۔ قیمت چار روپیہ۔

نوبہاراں

حضرت اثر لکھنوی کی منتخب غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ انتخاب پروفیسر احتشام حسین اور جناب نجم الدین شکیب نے کیا ہے اور ۳۹ء سے ۵۶ء تک کی تمام غزلوں پر مشتمل ہے۔

انتخاب کی مناسب صورت یہ ہوا کرتی ہے کہ ہر غزل میں سے بہتر اشعار چن لئے جائیں۔ کیونکہ اس طرح شاعر کے تمام اچھے اشعار سامنے آجاتے ہیں، لیکن پوری پوری غزلوں کا انتخاب اسی وقت ہو سکتا ہے جو کسی غزل کے سارے اشعار اچھے ہوں اور یہ بہت مشکل ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ انتخاب کرنے والوں نے پوری غزلیں لے لی ہیں یا محض منتخب اشعار لئے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزلوں کے اشعار کا انتخاب نہیں کیا گیا۔

ایک اہم فروگزاشت اس انتخاب میں یہ ہے کہ غزلوں کو ردیف وار مرتب نہیں کیا گیا اور نہ سنہ وار فہرست شامل کی گئی۔ اس لئے ہم بغیر شمار کئے ہوئے نہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہر سال کی کتنی غزلیں انتخاب میں شامل ہیں نہ یہ کہ کل غزلوں کی تعداد کتنی ہے۔ اب رہا نفس انتخاب کا مسئلہ سو، غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب واقعی اچھا کیا گیا ہے اور زیادہ تر انھیں غزلوں کو لیا گیا ہے جن کے اکثر اشعار اچھے ہیں جناب اثر کی شاعری اور ان کے رنگِ سخن کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے اور ان کے کلام کی پختگی کا ہر شخص قایل ہے۔

۳۹ء سے قبل کا کلام کیوں اس میں شامل نہیں کیا گیا، اس کا کوئی سبب ظاہر نہیں کیا گیا اور اگر اس کمی کو کسی دوسری جلد سے پورا کرنا تھا، تو ابتدائی غزلوں ہی سے کیوں نہ اس کا آغاز کیا گیا۔

۳۹ء کی پہلی غزل کے بعض اشعار یہ ہیں:۔

تھا مژدۂ بہار پیامِ شکستِ رنگ — دل خون ہو گیا، گل و گلزار دیکھ کر
بے اختیار اہلِ وطن یاد آ گئے — باہم سلوک آہن و خار دیکھ کر
پھولوں کا بس نہیں کہ قدم بڑھ کے چوم لیں — اک نوبہار ناز کی رفتار دیکھ کر
کوچہ کا اس کے ہے یہ پتہ جانِ بیقرار — آتی ہے نیند سایۂ دیوار دیکھ کر

۵۵ء کی آخری غزل اس رنگ کی ہے:۔

جب نظر سوئے ذات جاتی ہے — تا محیطِ صفات جاتی ہے

سخت پُرپیچ و خم ہیں وہ راہیں جن سے ہو کر حیات جاتی ہے
چھوڑ جنت کی فکر اے زاہد عشرتِ ممکنات جاتی ہے
ساتھ ہے حسرتوں کا ایک ہجوم زندگی کی برات جاتی ہے

ان کے دیکھنے کے بعد یہ آسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ ایامِ شباب و عہدِ شیب کے تصور و خیال میں کتنا نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ جوانی میں شاعر محبوب کی باتیں کرتا ہے خود اس سے تسکین پانے کے لئے اور ضعیفی میں صرف دوسروں کو درس اعتبار و بصیرت دینے کے لئے۔
ضخامت ۲۰۲ صفحات۔ طباعت و کتابت نفیس۔ قیمت دو روپیہ چار آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

فلمی اشارے

عرصہ ہوا حیدر آباد میں ایک ادارہ "سینما اسوسی ایشن" کے نام سے قایم ہوا تھا جس کا مقصد فلم سازی کا صحیح ذوق پیدا کرنا تھا۔ وہ ادارہ تو خیر ختم ہو گیا لیکن اس کے ایک سرگرم رکن جناب لطیف احمد علوی اسی دھن میں لگے رہے اور انھوں نے اس دوران میں اپنے مضامین سے کافی یہ اصلاحی خدمت انجام دی۔
یہ کتاب انھیں کی فکر و نظر کا نتیجہ ہے۔ اس وقت فلمی کاروبار دنیا میں بڑی ترقی پر ہے اور فنی حیثیت سے بھی وہ برابر قدم آگے بڑھا رہا ہے۔ چنانچہ ہندوستان نے بھی کافی کاروباری ترقی حاصل کر لی ہے، گو فن اور فنی نزاکتوں کے لحاظ سے وہ ابھی بہت پیچھے ہے۔ فلمسازی کی کامیابی کا انحصار زیادہ تر نفسیات دانی پر ہے اور ہمارے یہاں سب سے کم اس پر توجہ دیجاتی ہے اور صرف عوام کے ذوق کو آسودہ کر کے اسے صرف مادی نفع کی چیز تصور کر لیا گیا ہے اور اس کے تادیبی یا اصلاحی و اخلاقی پہلو پر بہت کم توجہ کیجاتی ہے۔
لطیف احمد صاحب علوی نے یہ کتاب اسی غرض سے لکھی ہے کہ فلم سازی اور فلم بینی کے صحیح اصول کو سامنے لائیں۔ اس میں انھوں نے بہت سی ٹکنکل باتیں بھی ایسی ظاہر کر دی ہیں، جن سے کافی فایدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ان لوگوں کے لئے مفید ہے جو فلم سازی کو فنی حیثیت سے اختیار کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کے لئے بھی جو ایک تماشائی کی حیثیت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔
ضخامت ۱۵۴ صفحات۔ قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ:۔ انوار بک ڈپو امین آباد لکھنؤ

ہمارے نبی کے صحابہ

تصنیف ہے جناب اعجاز الحق قدوسی کی جن کی متعدد کتابیں ایسی ہی تاریخی و اصلاحی حیثیت کی اس سے قبل شایع ہو چکی ہیں۔ حیدر آباد میں "اسلامک پبلشرز" کا مقصود اسی قسم کی کتابیں شایع کرنا ہے اور اعجاز الحق صاحب قدوسی نے اس سلسلہ میں بہت کچھ کیا ہے۔
اس کتاب میں انھوں نے اصحاب رسول کی کوئی تاریخ مرتب نہیں کی، بلکہ صرف یہ دکھایا ہے کہ عبادات و معاملات میں اصحاب رسول نے کس حد تک ارشاد نبوی کی پابندی کی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر صرف اُن صحابہ کا ذکر کیا ہے جو رسول اللہ سے قریب تر تھے اور جن کو صحبتِ نبوی کا زیادہ موقع حاصل تھا۔ اس کتاب میں نہ صرف عبادات و اخلاق، بلکہ دنیاوی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی معیشت و معاشرت پر بھی ذات نبوی کس قدر اثر انداز ہوئی۔ اس کتاب میں نہایت اختصار کے ساتھ واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے اور اس قدر سادہ و آسان زبان میں کہ بچے نہایت آسانی سے اسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اعجاز الحق کی اس کوشش کی قدر کی جائے گی اور اسلامی مدارس میں چھوٹے بچوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے گا۔
ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ اسلامک پبلشرز۔ چنچل گوڑہ۔ حیدر آباد دکن۔

سیرۃ بتول

یہ رسالہ بھی جناب اعجاز الحق قدوسی کا مرتب کیا ہوا ہے جس میں انھوں نے جناب فاطمۃ الزہراء کے حالات زندگی فراہم کر دئے ہیں۔ جناب فاطمہ آل نبوی میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حضرت خدیجہ آپ کی ماں تھیں اور حضرت علی آپ کے شوہر۔ آپ کے اخلاق کی بلندی اور صبر و شکر کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ باوجود نہایت فقیرانہ زندگی بسر کرنے اور ان ذہنی اختلافات کے جو ان کے اور حضرت علی کے درمیان پائے جاتے تھے، انھوں نے اپنی زندگی اسی شان و خودداری گزار دی

جو رسول اللہ کی صاحبزادی ہونے کی حیثیت سے گزارنا چاہئے تھی۔
حضرت فاطمہ تاریخ اسلام میں نہ صرف اس لئے بڑی اہمیت رکھتی ہیں کہ وہ رسول کی چہیتی صاحبزادی تھیں، بلکہ اس لئے بھی کہ انکے بطن سے جو اولاد پیدا ہوئی اس نے تاریخ اسلام میں بڑا انقلاب پیدا کیا۔
یہ رسالہ نہایت صاف و شگفتہ زبان میں لکھا گیا ہے اور اسلامک پبلشرز حیدرآباد سے ۱۲ر میں مل سکتا ہے۔

نقوشِ جاوداں

تابان القادری، کلکتہ کے ایک خوشگو شاعر تھے جنھوں نے جوانی میں انتقال کیا اور ایک بڑا حلقہ اپنے قدردان احباب کا پیچھے چھوڑ گئے۔ ان کا تعلق وہاں کی مشہور خانقاہ قادریہ سے تھا اور ہر طبقہ میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، اسی لئے ان کی جوانمرگی ایک ایسا حادثہ تھا جس کو سب نے محسوس کیا اور اپنے احساسات کو ذریعہ اخبارات ظاہر بھی کیا۔

اس رسالہ میں انھیں حضرات کے تاثرات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ان بیانات میں نہ صرف مرحوم کی زندگی بلکہ ان کی شاعرانہ اہمیت پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے اور ان کی چند غزلوں کو دیکھ کر جو رسالہ کے اخیر میں شامل کر دی گئی ہیں، واقعی اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مرحوم میں شعر گوئی کی بڑی اچھی صلاحیت پائی جاتی تھی۔ یہ رسالہ جناب سلیمان ڈوپلے نے مرتب کیا ہے اور ایک روپیہ میں انھیں سے مل سکتا ہے۔ پتہ درج نہیں ہے۔

نغمۂ آزادی

حکومت یوپی کے محکمۂ اطلاعات نے یہ رسالہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی یادگار میں، شایع کیا ہے اور اس میں بہادر شاہ ظفر، غالب، آزاد، حالی و شبلی سے لیکر اس وقت تک کے اکثر ان شعراء کی نظمیں یکجا کر دی ہیں جو کسی نہ کسی پہلو سے جنگ آزادی سے تعلق رکھتی ہیں۔
اس مجموعہ میں ان نظموں کو شامل نہیں کیا گیا جو "شہر آشوب" کے انداز سے لکھی گئی تھیں حالانکہ انھیں شامل کرنا چاہئے تھا اس میں شک نہیں ۱۸۵۷ء تاریخ ہند کا بڑا اہم سال تھا جس میں سب سے پہلے جنگ آزادی لڑی گئی اور اس کی یادگار منانے کا یہ طریقہ بہت اچھا تھا کہ اس موضوع پر خوش فکر شعراء کے خیالات کو یکجا کر دیا جاتا۔ یہ رسالہ ۴ر میں محکمۂ اطلاعات یوپی لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

ابوظفر بہادر شاہ
مولوی فضل حق خیرآبادی
مولوی احمد شاہ
عظیم اللہ خاں کانپوری

یہ چاروں رسالے بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے تعلق رکھتے ہیں، "ابوظفر بادشاہ" جناب مفتی انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی کا مرتب کیا ہوا ہے، جن کو تاریخ ہند میں بڑا عبور حاصل ہے۔ اس میں بہادر شاہ کے ابتدائی حالات سے لیکر ۱۸۵۷ء تک کے تمام حالات نہایت اختصار مگر جامعیت کے ساتھ یکجا کر دئے ہیں اور اخیر میں ان کی شاعری کا مختصر تعارف کراتے ہوئے ان کی چند غزلیں بھی شامل کر دی ہیں۔ یہ رسالہ سلطان حسین اینڈ سنز۔ بندر روڈ کراچی نے شایع کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ۔
باقی تینوں رسالے جنرل پبلشنگ ہاؤس بندر روڈ کراچی نے شایع کئے ہیں۔ یہ رسالے بھی جنگ آزادی کی تاریخی سلسلہ کی کڑیاں ہیں اور ان کے مصنف بھی جناب انتظام اللہ شہابی ہیں۔ ان رسایل میں نہ صرف ان مجاہدین کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ یہ بتایا گیا ہے کہ جنگ آزادی میں ان حضرات نے کتنا اہم حصہ لیا جو ذہن و عمل دونوں پر مشتمل تھا۔

مولانا فضل حق خیرآبادی کے کارناموں سے تو ایک نہ ایک حد تک وہ تمام حضرات واقف ہیں جنھوں نے عہد غالب اور تاریخ رامپور کا مطالعہ کیا ہے لیکن مولوی احمد شاہ اور عظیم اللہ خاں کانپوری کی مجاہدانہ سرگرمیوں سے لوگ کم واقف تھے۔
مولوی احمد شاہ کا خاندانی سلسلہ ابوالحسن تاناشاہ سے ملتا ہے۔ دکن میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی، یہاں سے یہ حیدرآباد آئے اور پھر آگرہ، دہلی، فیض آباد وغیرہ میں تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔ لکھنؤ میں جب بیلی گارد پر حملہ ہوا تو اس کے قاید و رہنما یہی تھے۔

ان کے بعد مسلمانوں میں دوسری اہم شخصیت نے جس نے جنگ آزادی میں پوری سرفروشی سے کام لیا، عظیم اللہ خاں کانپوری تھے یہ نسباً افغان تھے اور اخیر میں نانا راؤ پیشوا کے بڑے معتمد علیہ ہوگئے تھے۔ یہ نانا راؤ کی طرف سے بہ حیثیت سفیر انگلستان بھی گئے اور عرصہ تک نانا کے مشیر خصوصی رہے۔

کانپور میں جنگ آزادی کے روح رواں یہی تھے اور نانا راؤ کے تمام کارنامے اس سلسلہ میں انھیں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ تینوں رسالے دس دس آنے میں جنرل پبلشنگ ہاؤس بندر روڈ کراچی سے مل سکتے ہیں۔

رہبرِ حج تصنیف ہے جناب سید محمد احمد کاظمی کی جو تاریخ حرمین بھی ہے اور ان کا سفرنامہ بھی جو بہ سلسلۂ حج انھوں نے مرتب کیا ہے۔ یہ رسالہ سفرنامہ ہونے کی حیثیت سے دلچسپ، تاریخ حرمین ہونے کے لحاظ سے مستند اور ارکانِ حج کی تعلیم و ہدایت کے نقطۂ نظر سے بڑی مفید چیز ہے۔ اس میں چند نقشے اور تصاویر بھی شامل ہیں جنھوں نے اس کتاب کو زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

اندازِ بیان بہت سلجھا ہوا اور دلچسپ ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ حجم ۲۴۴ صفحات۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ علمیہ قاضی اسٹریٹ کلکتہ۔

دراسات اللبیب اس کتاب کا پورا نام "دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب" ہے۔ یہ علامہ مخدوم محمد معین کی تصنیف ہے جو سندھ کے مشہور متکلم عالم تھے، یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور عرصہ سے نایاب تھی۔ اب سندھ کے ادارۂ احیاء الادب السندی (کراچی) نے اسے ٹائپ میں شایع کیا ہے۔ یہ ادارہ ۵۶ء میں قایم ہوا تھا اور اسوقت تک متعدد نایاب کتابیں فارسی، اردو کی شایع کر چکا ہے۔ عربی کتابوں میں اس نے یہ پہلی کتاب شایع کی ہے اور دوسری کتابوں کی اشاعت اس کے زیرِ غور ہے، جو رفتہ رفتہ شایع ہوتی رہیں گی۔

تقسیم ہند کے بعد سرزمین سندھ کی یہ علمی بیداری بڑی فال نیک ہے اور ہمیں امید ہے کہ اس کی یہ خدمات بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔

ضخامت ۵۶۴ صفحات۔ قیمت بارہ روپئے۔ سندھی ادبی بورڈ کراچی۔

بدرِ کامل مجموعہ ہے جناب خبیر لکھنوی کے سات مرثیوں کا جو امام جعفر صادق سے لیکر حضرت حجۃ امام العصر تک کے حالات پر مشتمل ہے جناب خبیر کے سات مراثی کے ایک مجموعہ پر نگار میں اس سے پہلے تبصرہ شایع ہو چکا ہے۔ جناب خبیر، حضرت آوج کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں اور اس وقت فنِ مرثیہ گوئی میں تنہا یادگار اس دور کی ہیں جب مراثی کے ذریعہ سے زبان و اخلاق دونوں کی اصلاح کی جاتی تھی۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ ممتاز بک ایجنسی۔ نخاس۔ لکھنؤ۔

"نگار" کے بعض سالناموں کی قیمت میں اضافہ

مومن نمبر (تین روپیہ) —— ریاض نمبر (ڈھائی روپیہ) —— پاکستان نمبر (چار روپیہ) —— مشرق وسطیٰ نمبر (تین روپیہ)
داغ نمبر (چار روپیہ) —— فرمانروایان اسلام نمبر (چار روپیہ) —— خدا نمبر (چار روپیہ) —— اصنافِ سخن نمبر (چار روپیہ)

بعض نایاب سالنامے:۔

ہندی شاعری نمبر = (صرف ایک کاپی موجود ہے)۔ پانچ روپیہ فی کاپی —— اصحاب کہف نمبر = (صرف تین کاپیاں موجود ہیں)۔ تین روپیہ فی کاپی
تاریخ اسلامی ہند نمبر = (صرف چھ کاپی موجود ہیں)۔ چار روپیہ فی کاپی —— مصحفی نمبر = (صرف ۵ کاپی موجود ہیں)۔ پانچ روپیہ فی کاپی
ماجد و لین نمبر = (صرف دو کاپی موجود ہیں)۔ پانچ روپیہ فی کاپی —— (محصول ڈاک علاوہ دیا جائے گا اور کمیشن نہ مل سکے گا)

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز

(تین حصّوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصّہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیانِ طریقت و علمائے کرام کی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

۵۵ سال کے بعد

ایک بے مثل نفسیاتی مطالعہ جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ۵۵ سال کے بعد سرورِ زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے زبان و انداز بیان کے لحاظ سے یہ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ناول کا سا لطف دیتی ہے۔ یہ کتاب انگریزی زبان کے ایک شاہکار کا ترجمہ ہے۔ قیمت ۱۲ (علاوہ محصول)

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کا ثبوت انھوں نے دورِ حاضر کے بعض اکابر شعرا، مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے، ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان تخئیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشاءِ عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

مذاکراتِ نیاز

یعنی نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقیدِ عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہر حیثیت سے صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مؤرخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزل گوئی پر عہد بہ عہد تبصرہ، نقش ہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، نثر، اڈیٹر حقیقت نگاری۔ قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

اس کے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات و بیماری شہرت و نیک نامی پر پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

RECD.N-A-466

رجسٹرڈ نمبر ۴۶۶ اے

نگار کے خاص نمبر

سال نامہ ۱۹۲۸ء (مومن نمبر)

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از حد ضروری ہے۔ قیمت تین روپے (علاوہ محصول)

جنوری ۱۹۴۳ء (ریاض نمبر)

اس نمبر میں ریاض خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۸ء (پاکستان نمبر)

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء (افسانہ نمبر)

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں۔ اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بہ آسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اصول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۱ء (مشرقی و مغربی نمبر)

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں اڑیسہ ہندی کی مشہور عالم کتاب، ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں اس میں ایران، مصر، عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے۔ اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں، سالنامہ کو دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی، حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۳ء (داغ نمبر)

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء (فرمان روایان اسلام)

(فرمان روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے، یہ سال نامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیے۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء (علوم اسلامی نمبر)

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) یہ تحقیقی نمبر جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ چار آنہ علاوہ محصول)

سال نامہ ۱۹۵۶ء (خدا نمبر)

خدا کا تصور عہد تاریک سے لے کر عہد حاضر تک۔ بے مثل تاریخی و تحقیقی تبصرہ مذاہب عالم پر۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول)

سال نامہ ۱۹۵۷ء (اصناف سخن نمبر)

غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ مرثیہ وغیرہ جملہ اصناف سخن پر ایک بیش بہا ذخیرہ معلومات۔ قیمت چار روپیہ (علاوہ محصول) منیجر نگار لکھنؤ